ادبی سلسلہ نمبر 2

ماہنامہ

القلم

اردو جہانیاں

انچارج	ثنا اکرم ملھی
چیف ایڈیٹر	تنہاؔ لائلپوری

رابطے کا ذریعہ:

tanhalyallpuri@gmail.com

0305 854 5555

فہرست

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
1	اداریہ	ثنا اکرم ملی	3
2	حمدِ باری تعالیٰ + نعتِ سرورِ کونین ﷺ	شازیہ آفرینؔ	4+5
3	پینسلین کی ایجاد	شازیہ آفرینؔ	6
4	بنتِ حوا کی آواز	تنویر حسن	7
5	مثبت توقعات	محمد حسن مختار	9
6	عورت	اقصیٰ شفیق	10
7	صالح معاشرے کی تشکیل	محمد فرید فریادؔ	11
8	باکردار لڑکی	عفت خان	12
9	اردو زبان سے دوری	لاریب فاطمہ	13
10	یومِ دفاعِ پاکستان	مروہ فاطمہ	15
11	عاصم بخاری کی شاعری میں انگریزی الفاظ کا برتاؤ	مقبول ذکی مقبول	17
12	ویلیوز آف مائی سیلف	ستارہ منیر	20
13	یومِ دفاعِ پاکستان	مصدق احمد رانا	22
14	پنسلین	آمنہ یونس	24
15	ہجرتِ مدینہ اور غارِ ثور	افشین شہر یار	25
16	استاذ کی عظمت	مہوش حمید	27
17	چرواہے کی حکیمانہ باتیں	خالد سیف اللہ	29
18	وہ ہستی جسے تم ارزاں سمجھتے ہو	سعدیہ ناز	30

فہرست

نمبر	عنوان	مصنف	صفحہ
19	مولانا رومی	عائشہ شاہد	32
20	پنسلین کی ایجاد	سیدہ رابعہ	35
21	مولانا رومیؒ	سیدہ رابعہ	37
22	جبری گمشدگی	سیدہ رابعہ	39
23	نوائے دل	محمد عمر فیاض	41
24	شرر فشاں	خ ا ملہی	43
25	الجہاد سیریز	ع ا ملہی	45
26	ہائے سائنس، وائے سائنس (مزاح)	شازیہ آفرینؔ	55
27	غزل (شاعری)	رفیقؔ چوگلے	57
28	بچوں کی نظم (شاعری)	محمد فرید فریادؔ	58
29	خط	خالد سیف اللہ	59
30	جوابی خط	ثنا اکرم ملہی	60

اداریہ

ثنا اکرم ملہی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حمد و ثناء رب العالمین کے لیے جس کی دی گئی توفیق سے ادارہ کی جانب سے پہلا شمارہ کامیاب رہا۔ یہ ادارہ کا پہلا شمارہ تھا جسے گزشتہ ماہ کے وسط میں منظرِ عام پر لایا گیا، جس کے بعد ادارہ کی مشاورت سے آئندہ شمارہ مہینے کے پہلے ہفتے نکالا جانا طے ہوا۔ "القلم اردو جہانیاں" میگزین کے معزز لکھاری حضرات کی تحاریر وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہیں، میگزین کو کامیاب بنانے پہ ادارہ مشکور ہے۔

اپنے معززین قلم کاروں کے نام تشکر اور سلامتی۔

اردو نہ صرف پاکستانیوں کی پہچان ہے بلکہ پوری دنیا میں برصغیر سے تعلق رکھنے والے ہر باشندے کی پہچان اردو کی مرہونِ منت ہے۔ اردو کی ترویج و ترقی ہم سب کا قومی فریضہ ہے۔ دنیا کی تیز دوڑ میں اپنی پہچان باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اردو کو اپنائیت دینا ہو گی۔ اپنی روز مرہ کی زبان میں انگریزی الفاظ کی جگہ اردو کا استعمال کرنا ہو گا۔ ہمیں اردو زبان سے محبت قرطاس و قلم کی حد تک نہیں بلکہ زندگی کے ہر موقع پہ کرنا ہو گی۔ ورنہ جیسے فارسی زبان کتابِ ماضی میں پڑی اپنوں کی یاد میں جل رہی ہے ویسے ہی اردو اپنوں سے دور ہو جائے گی جس کا ازالہ کوئی دوسری زبان نہ کر سکے گی۔ ہمارے قاری و لکھاری اردو کے دلدادہ ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ایک دن اردو کا اوج پھر سے اعوانِ بالا میں اپنی آب و تاب دکھائے گا، ان شاءاللہ تعالیٰ!

قارئین کا اور اہلِ قلم کا نیا شمارہ پیش ہے۔

مطالعہ کے بعد اظہارِ رائے دینا نہ بھولیے۔

اللہ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام
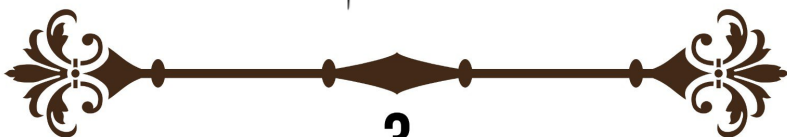
حمدِ باری تعالیٰ

شازیہ آفرینؔ

کتنا عظیم ہے اے اللہ! نام تیرا
اعلیٰ ہے کہ عظیم الشاں ہے مقام تیرا
اول بھی تُو ہے، آخر بھی تُو حیؐ القیّوم ہے
لافانی ذات تیری، قبلہ دوام تیرا
خالق بھی تُو کہ مالک بھی تو ہے دو جہاں کا
کل کائنات پر رائج ہے نظام تیرا
پیغام ہم کو بھیجا محبوبؐ کے ذریعہ
اقدس حبیبؐ تیرا، افضل کلام تیرا
روشن کیا فلک کو، سبزہ دیا زمیں کو
دلکش ہے، خوبصورت ہے انتظام تیرا
رکھتا ہے اپنی خلقت سے بے پناہ الفت
کونین میں مرے رب ہے فیضِ عام تیرا
بندوں کے تو شہہِ رگ سے بھی قریب تر ہے
ہر ذرے ذرے میں اے مالک! قیام تیرا
تو نے کہا ہے: اِنَّ اللہ مَعَ الصّٰبِرِین
ظالم سے خوب بہتر ہے انتقام تیرا
جرات ہے کس میں اس کا اک بال کر دے بیکا
رب ذوالجلال نازل جس پر سلام تیرا
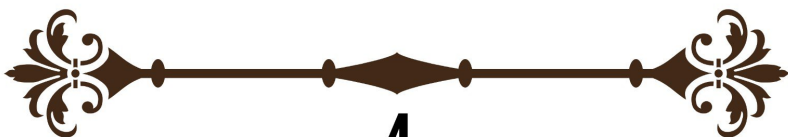
نعتِ سرورِ کونینؐ

شازیہ آفرینؔ

رشکِ جا، امتیِ سیدِ ابرارؐ ہوں میں
عاشقِ شاہِ رسلؐ کہ شہِ انوارؐ ہوں میں

کیجیے ایک نظر اپنے کرم کی مجھ پر
یا نبیؐ آپ کی شفقت کی طلبگار ہوں میں

کیجیے پھر سے عطا اپنا منور جلوہ
آرزو دیدِ محمدؐ لیے بیمار ہوں میں

پھیریئے دستِ کرم سر پہ مرے دوبارہ
ہر گھڑی رنج و آلام سے دو چار ہوں میں

مدعا کیجیے پوری مری پیارے شاہاؐ
اپنی فریاد لیے حاضرِ دربار ہوں میں

بخشوائیں گے ہمیں رب سے یہ منت کر کے
ہاں کرم سے نبیؐ کے خلد کی حقدار ہوں میں

بندی اللہ کی ہوں، میرا خدا ایک وہی
دینِ اسلام کی ہی پرچمِ بردار ہوں میں

ہاتھ سے میرے نہ بچ پائے گا گستاخِ نبیؐ
اس کا سر کاٹنے کو برسرِ پیکار ہوں میں

میرا تن من ہے فدا میرے محمدؐ پہ سدا
نامِ آقاؐ پہ تو مر جانے کو تیار ہوں میں

پینسلین کی ایجاد

شازیہ آفرین

ہم سب جانتے ہیں کہ بیماری کے علاج کے لیے دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوا و صحت کا تعلق علمِ طب سے ہے۔ طب ایک سائنس بھی ہے کیونکہ اس کی عمارت، محنت و لگن سے کیے گئے تجربات اور دقیق مطالعہ سے حاصل ہونے والی معلومات پر کھڑی ہے اور یہ ایک فن بھی ہے کہ اس کی کامیابی کا انحصار طبیب کی ذاتی فہم اور مہارتِ عمل پر ہوتا ہے کہ وہ کس صلاحیت سے علمِ طب کی معلومات کو استعمال کرتا ہے۔ علمِ طب کا ایک شعبہ بائیو کمیسٹری نے میڈیکل، بائیوٹیکنالوجی اور سائنس کے دیگر شعبوں کی بہت سی اہم پیش رفت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ بائیوکیمسٹ خلیات (Cells) کے اندر ہونے والے کیمیائی عمل (کیمکل ری ایکشن) اور ردِ عمل کو سمجھ کر بیماریوں کے لیے نئے علاج تیار کرتے ہیں۔ کیمسٹری کے سب سے دلچسپ اور اہم کارناموں میں سے ایک پینسلین کی دریافت ہے۔ یہ سب سے پہلی اینٹی بائیوٹک ہے۔

اس کی ایجاد حادثاتی طور پر ہوئی۔ سنہ 1928ء میں اسکاٹش ڈاکٹر الیگزینڈر فلیمنگ لندن کے سینٹ میری ہسپتال میں انفلوئنزا کے موذی وائرس کو کنٹرول کرنے کے طریقوں پر کام کر رہے تھے۔ اس کے لیے فلیمنگ اپنی لیبارٹری کی میز پر سٹریپٹوکوکس نامی بیکٹیریا کی افزائش کر رہے تھے۔ پھر وہ دو ہفتے کی چھٹیوں پر چلے گئے۔ واپسی پر انھوں نے دیکھا کہ لیبارٹری کی جس ڈش میں انہوں نے بیکٹیریا کلچر کیے تھے۔ اس ڈش پر ہوا میں موجود پینسلیم نامی ایک قسم کی پھپھوند جم گئی تھی اور اس پھپھوند نے بیکٹیریا کی افزائش روک دی تھی۔ فلیمنگ نے پھپوند کی ماہیت پر تمام توجہ مرکوز کر دی۔ انہوں نے دیکھا کہ اس فنگس کے گرد ایک حلقہ بن گیا ہے جہاں بیکٹیریا داخل نہیں ہو پا رہے تھے۔

اس مشاہدے سے فلیمنگ کے تجسس میں اضافہ ہوا اور انہوں نے فنگس کا قریب سے مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا اور دریافت کیا کہ اس فنگس نے بہت سے بیکٹیریا کو مار ڈالا جس کا وہ مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس پھپھوندی سے جو مادہ الگ کیا اسے پینسلین کا نام دیا۔ یوں پنسلین دریافت ہوئی فلیمنگ نے مطالعہ کے بعد پایا کہ پینسلین کی صلاحیت کو ایک طاقتور اینٹی بائیوٹک کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ اسے (پینسلین) بڑی مقدار میں پیدا کرنے کا طریقہ تیار کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے 1929ء میں اپنے نتائج شائع کیے، اس وقت ان پر بہت کم توجہ دی گئی۔

ہاورڈ فلوری اور ارنسٹ شین نامی دو سائنسدانوں نے پینسلین کو بطور دوا تیار کرنے پر کام شروع کیا۔ وہ انسانوں اور جانوروں پر پینسلین کی جانچ شروع کرنے کے لیے کافی پینسلین پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں انہیں کامیابی ملی۔

کی دریافت میڈیکل کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا، اور یہ الیگزینڈر کے تجسس، استقامت اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بہت سے سائنسدانوں کی لگن اور محنت سے ممکن ہوا۔ آج پینسلین اور دیگر اینٹی بائیوٹیکس دنیا بھر میں زندگیاں بچا رہی ہیں۔ اس دریافت کے لیے فلیمنگ کو نوبل انعام سے نوازا گیا۔ 1945ء میں اپنی نوبل انعام کی تقریب میں فلیمنگ نے اس دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "1928ء میں میری ایک کلچر پلیٹ میں فنگس کی حادثتاً آلودگی نے مجھے ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔پہلے میں ایسے موضوع پر کام کر رہا تھا جس کا فنگس یا جراثیم کش ادویات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ میری اور انسانیت کی خوش قسمتی ہے کہ میں اپنی بنیادی تحقیق چھوڑ کر اس نئے راستے پر چل پڑا ورنہ میں آج یہاں نوبل انعام یافتہ کے طور پر موجود نہ ہوتا۔"

بنتِ حوا کی آواز

تنویر حسن

خدائے واحد نے کائنات کو وجود بخشا تو خاک کے خمیر میں ظلم اور رحم کی حدت کے ساتھ، جب جذبات کی آمیزش کی گئی تب قرطاسِ کائنات پر آدمیت کا ظہور ہوا۔ خاک سے بنے آدم کی دل جمی کے لیے اللہ پاک نے مٹی سے مٹی کو جدا کر کے حضرتِ حوا کو تخلیق کیا تو انسان ظلم کے حصار میں آ کر ظالم ٹھہرا اور بنتِ حوا کو جبر کا نشانہ بنانے لگا، اس جبر کے خلاف صنفِ نازک کی حرکت کو بنتِ حوا کی آواز تصور کیا گیا جس کو ہر زمانے میں دبانے کی کوشش کی گئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب لکھا ہے:

ے کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر
فعلِ بد خود ہی کریں، لعنت کریں شیطان پر

(انشاء اللہ خاں انشآء)

زندگی کے ہر میدان میں عورتوں نے بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیے ہیں۔ میدانِ ادب میں دھاک بٹھا دینے والی ورجینیا وولٹ، میری شیلے، بانو قدسیہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ادا جعفری اور قرۃ العین حیدر کے علاوہ پروین شاکر کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ اسی طرح میدانِ سیاست میں دھاک بٹھا دینے والی کوئین وکٹوریہ، چاندنی بی بی، رضیہ سلطانہ، لیلیٰ خالد، بے نظیر بھٹو کے علاوہ جمیلہ الجزائری شامل ہیں جو کہ دنیا کے لیے مثال ثابت ہوئیں۔ ان کے اس جذبے اور دوڑ دھوپ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت مظلوم نہیں بلکہ اسے کمزور اور مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بنتِ حوا کی ہمت کو پست اور آواز کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، اسی طرح اگر عورت کی جہد کی بات کی جائے تو بلوچستان میں زرینہ مری، کریما بلوچ، فرزانہ مجید کے ساتھ سیما بلوچ جیسی بہادر بیٹیاں بلوچستان میں ہونے والی بربریت اور ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھائے نظر آتی ہیں۔ کسی نے اس کیفیت کی کیا خوب عکاسی کی ہے:

ے کیوں روند ڈالتے ہیں بے جا بنتِ حوا کو
تماشہ بنی پھرتی ہے آدم کے فرزندوں سے

ے کبھی ساحل پہ بیٹھے خاموش جگنو کی طرح
تو ایسے ہی مضبوط جیسے سمندر کی چٹان

ے مگر ان ہواؤں کے شور سے دب نہ سکے گی
یہ گونج جو اٹھی ہے صدیوں کی خاموشی سے

(جویریہ بلوچ)

اگر گاؤں کے تناظر میں دیکھا جائے تو بنتِ حوا پر بے جا پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ مرضی کی شادی کر سکتی ہے نہ ہی تعلیم اور اگر وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے تو شدید تشدد کے ساتھ قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں حالانکہ اس کے برعکس حدیث پاک ﷺ ہے:

"تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں اچھے ہیں"۔

(جامع ترمذی، جلد اول، 1169)

بنتِ حوا کی آواز

تنویر حسن

جدید معاشرے میں معاشی ضروریات کے تحت صنفِ نازک گھر سے باہر قدم رکھ کر ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ تو آ گئی ہے لیکن تعلیمی ادارے ہوں یا دفاتر، چوک چوراہے ہوں یا گھر، عورت کو بچپن سے لے کر جوانی تک جنسی ہراسانی کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات کی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ کبھی موٹر وے پر تو کبھی سکول سے اٹھا کر، کبھی گھر تو کبھی بازار میں عورتوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ملک میں قوانین ہونے کے باوجود قصور وار سرے عام گھوم رہے ہیں۔ مرزا نوشہ نے کیا خوب لکھا ہے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
(مرزا غالبؔ)

معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا موضوع قدیم ایام سے ہی مختلف معاشروں اور تہذیبوں میں زیر بحث رہا ہے۔ دنیا کی آدھی آبادی عورتوں پر مشتمل ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی کا دار و مدار جتنا مردوں پر ہے اتنا ہی بنتِ حوا پر بھی ہے جبکہ فطری طور پر عورتیں خلقت کے انتہائی اہم امور سنبھال رہی ہیں۔ خلقت کے بنیادی امور جیسے عملِ پیدائش اور تربیتِ اولاد عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔

معلوم ہوا کہ عورت ذات کا مسئلہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اور قدیم زمانے سے ہی معاشروں میں مفکرین کی سطح پر اسی طرح مختلف قوموں کی رسوم و روایات اور عادات و اطوار میں اس پر توجہ دی جاتی رہی ہے لیکن اس کے باوجود بنتِ حوا کی آواز کو بلند کرنے کے لیے خواتین کے عالمی دن (8 مارچ) کے علاوہ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں مثلاً "عورت فاؤنڈیشن، اسلام آباد ویمن ویلفیئر ایجنسی، چرچ ورلڈ سروس (پاکستان/افغانستان)، ورکنگ ویمن آرگنائزیشن" قابلِ ذکر ہیں جن کے تحت حالات پر قابو پانے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ معاشرے سے صنفی امتیاز کا خاتمہ اور انقلاب لایا جا سکے۔ بقول شاعر:

؎ تُو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تُو بھی انقلاب پیدا کر
(اسرارالحق مجاز)

مختصر ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخِ اسلام کے مطالعے، قرآن و سنت کی تعلیمات کو مدِ نظر رکھ کر اپنے انفرادی اور اجتماعی فرائض سے آگاہی حاصل کریں اور عملی طور پر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوں تاکہ بنتِ حوا کو تمام حقوق مل سکیں۔
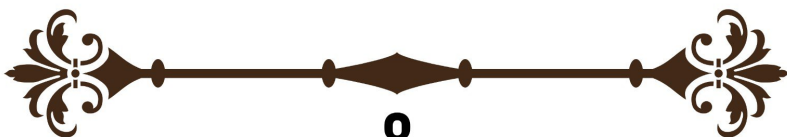
مثبت توقعات

محمد حسن مختار

ہر بہترین اور خوشحال خاندان، ایسے خاندان جن کے بچے کئی کامیابیاں سمیٹتے ہیں، ان خاندان میں ایک خاص خوبی ہوتی ہے، "مثبت توقعات"۔

یہ تحقیق ایک امریکی سائیکولوجسٹ Mc Clelland نے کی جس کے مطابق ہر کامیاب خاندان میں ایک خوبی ملتی جلتی ہوتی ہے کہ وہ بچوں سے اچھی اور مثبت توقعات رکھتے ہیں۔ ان خاندان میں بچوں کو والدین یہ یقین دہانی کرواتے ہیں کہ وہ ان سے بہت پیار کرتے ہیں، ان بچوں کو ہمیشہ مثبت باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ ان بچوں کو معلوم ہوتا ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے والدین ان کے ساتھ ہیں۔ وہ بچے والدین کو مایوس نہیں کرتے، سیکھتے جاتے ہیں اور آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک دن آتا ہے کہ اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کر دیتے ہیں۔ جب بھی انسان کو کسی کام میں حوصلہ افزائی ملے تو وہ اسے مزید بہتر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ جیسی توقع رکھیں گے آپ کو ویسا ہی سب کچھ ملے گا۔ توقعات ہی حقیقت بن جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں جب بچپن سے ہی بچوں کو منحوس، نکما، سست، بے وقوف، تو زندگی میں کچھ نہیں کر سکتا، رشتوں داروں کے تیرے سے اچھے نمبر آئے ہیں۔ جیسی باتیں سننے کو ملیں تو وہ زندگی میں کچھ نیا کرنے کی ہمت پیدا نہیں کر سکتا۔ بچوں کا دماغ محدود کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ بڑا سوچنے کے قابل نہیں رہتے اور اگر کوئی بڑا سوچنے لگے تو اسے پاگل کہ کر چپ کروا دیا جاتا ہے۔ آج ہماری ہر ممکن کوشش یہی ہے کہ ہمارے بچے ایک روبوٹ بن جائیں۔ سارا دن کتابیں یاد کریں اور پھر پاس ہو جائیں۔ بچپن پڑھنے میں اور زندگی پیسوں کے چکر میں گزار دیتے ہیں۔ جب بوڑھے ہوتے ہیں اس وقت معلوم ہوتا کہ پیسے کے ساتھ وقت ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ بوڑھے شخص کے پاس پیسہ ہوتا ہے لیکن وہ بچپن اور جوانی کا وقت نہیں ہوتا، اس لیے اپنی زندگی کا ہر دن اچھی طرح جی لینا چاہیے تاکہ بعد میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔

ماضی سے بس سبق سیکھیں، حال میں اچھے کام کریں کیونکہ ان کے نتائج آپ کو مستقبل میں ضرور ملیں گے اور مستقبل کی ہمیشہ اچھی توقع رکھیں۔ زندگی میں توازن پیدا کریں اور بچوں کی زندگی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، ہر وقت ایک چیز کا نہیں ہوتا۔ اچھی توقع رکھیں نتائج جو بھی آئیں خوشی سے قبول کر لیں۔ کبھی بھی حد سے زیادہ کسی شخص سے توقع مت رکھیں۔ اس سے دباؤ بڑھ جاتا ہے ایک بچے سے والدین توقع رکھتے ہیں کہ وہ میٹرک میں1050 نمبر حاصل کرے گا اب اس سے ہو سکتا ہے بچہ خود پر دباؤ محسوس کرنے لگے کہ اگر اتنے نمبرز نہ آئے تو پھر کیا ہو گا وغیرہ۔ دنیا کی ہر چیز میں توازن مفید ہوتا ہے اگر ہم توازن برقرار نہ رکھیں تو پھر ہم مشکلات کا شکار ہو سکتے ہیں۔

زندگی میں حوصلہ دینے والے بن جائیں اور اچھی توقع رکھیں لوگ آپ کو ایسی کارکردگی دکھائیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ ایک قانون ہے جسے Law Of Expectation بھی کہا جاتا ہے اس قانون کے مطابق آپ جس بھی چیز کی توقع کرتے ہیں وہ حقیقت بن جاتی ہیں۔ آپ چاہے چھوٹی یا بڑی جس چیز کی بھی توقع کریں گے وہی ملے گی۔

آپ زندگی میں اچھی چیزیں لانا چاہتے ہیں تو اچھی چیزیں سوچیں اپنے بچوں کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو خود اچھے بنیں اور اچھے کی توقع رکھیں۔ آپ گھر میں بھی حوصلہ دینے والے بنیں۔ اچھے کام پر شاباش دیں، برے کام پر اصلاح کریں۔ لوگوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ آپ ان سے پیار کرتے ہیں۔ آپ جیسا سوچیں گے ویسا ہی ملے گا۔

عورت

اقصیٰ شفیق

عورت بہت نازک اور نرم مزاج ہے، بہت عمدہ اور نایاب ہے۔ عورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی ہر روپ میں قدرت کا قیمتی تحفہ ہے جس کے بغیر کائنات انسانی کی ہر شے پھیکی اور ماند ہے۔ معاشرے کے بناؤ میں، تعمیر کے وقت اپنی خوشیاں، اپنی ذات اور اپنی پہچان بھلا دینے والی اور اپنی ہستی مٹا کر گھر کی شناخت کو ترجیح دینے والی عورت۔ اپنی قطرہ قطرہ کشید کی ہوئی خواہشوں کا رس اپنوں کی پیاس کے صحرا پہ لٹا دینے کا ظرف رکھنے والی عورت کا یہ کردار، ایثار، قربانی اور بے مثال محبت کا کردار ہے۔ اپنی سوچ کا گلا گھونٹ کر معاشرے کے لگے بندھے اصولوں کی آبیاری کرنے والی، اپنی خواہشوں کو بھول کر رشتوں کی ترجیحات میں درجہ بندی کرتے ہوئے اپنا آپ گنوانے، اپنی عمر کی نقدی دوسروں کی ضروریات پر خرچ کرنے والی اور اپنی ذات کو مٹا کر دوسروں کو پہچان دینے والی عورت۔ یہ آج بھی سر اٹھا کر بات کرتی ہے چاہے اس کی آنکھوں میں پانی ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام نے عورت کو اعلیٰ مقام دیا ہے، اسلام کی نظر میں انسانی لحاظ سے مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ عورت پر سے دائمی معصیت کی لعنت ہٹا دی گئی اور اس پر سے ذلت کا داغ دور کر دیا گیا۔ عورت کو زندہ زمین میں گاڑے جانے سے خلاصی ملی۔

افسوس ہمارے معاشرے میں خواتین عزت سے زیادہ غلامی اور سمجھوتوں کو ترجیح دیتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو کمزور سمجھا جاتا ہے۔ عورت کو بہت کمزور سمجھا جاتا ہے لیکن اگر عورت کی زندگی کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو وہ مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اعصاب کی مالک ہوتی ہے لیکن خود کو معاشرے کی نام نہاد رسموں میں بندھ کر رکھتی ہے۔ عورت ایک ماں ،ایک بیٹی، بہن اور ایک بیوی کے روپ میں ساری زندگی سمجھوتوں اور قربانیوں کی نذر کر دیتی ہے۔عورت ہونے کا دکھ سمجھنے کے لیے آپ کو عورت بن کر مردوں کے معاشرے میں زندہ رہنے کی جد و جہد کرنی پڑے گی تبھی آپ یہ بھید جان سکیں گے عورت کیا ہے۔

اگر عورت کو رونے کے لیے کاندھا میسر نہ ہو تو وہ مضبوط ہو جاتی ہے، دوبارہ وہ کبھی آپ کے سامنے اپنا بکھرا ہوا وجود لے کر نہیں آئے گی۔ ایک دفعہ وہ آپ کو کوئی بات سنانا چاہے اور آپ کہو ابھی مصروف ہوں پھر کسی وقت سنانا تو وہ بات کبھی بتائے گی ہی نہیں پھر یونہی آہستہ آہستہ وہ مضبوط ہو جاتی ہے، پھر وہ ان سب رشتوں کے بغیر رہنا سیکھ لیتی ہے، پھر وہ کسی کی محتاج نہیں رہتی۔آج کی عورت کو اپنی خوبصورتی پر کہے جانے والے ستائشی کلمات کی نہیں بلکہ اپنی سوچ اور خیال کی ندرتوں کی حوصلہ افزائی چاہیے۔ آج کی عورت کو اپنے تخلیقی اظہار کے ذرائع کو استعمال کرنے کا حق چاہیے۔

صالح معاشرے کی تشکیل

محمد فرید فریادؔ

تربیت ہی اصل ضرورتِ اکبر ہے
یہی طفلِ مکتب کل قوم کا رہبر ہے
(محمد فرید فریادؔ)

دنیا میں کسی بھی فرد یا قوم کی ترقی یا تنزلی میں سب سے اہم کردار اس کے اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور ہمسایوں کا ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ہر کام میں اللہ کی مرضی اور تقدیر کو دخل ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں مخالفت اپنے ہی شروع کرتے ہیں حتی کہ لوگوں کو تقدیر پر بھی یقین نہیں رہا اور جن کو ہے وہ تمام تر مخالفت کے باوجود بھی کامیاب ہو جاتے ہیں آج ہم جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس پر سینکڑوں برائیوں کا پہرا لگا ہوا ہے اور شب و روز نت نئے فتنے سر ابھار رہے ہیں۔ ہمیں کسی سے کوئی شکوہ و شکایت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ہم نے اپنی کامیابیوں کے تمام تر راستے خود ہی غیروں کے طریقے پر زندگی گزار کر مسدود کر دیے ہیں۔ جب ہمارے آنگن میں بچے کی آمد کی امید ہوتی ہے تو اس وقت ہماری مائیں اور بہنیں دن رات قرآن و حدیث سے ہٹ کر فلموں، ڈراموں اور پر فحش و عریاں تصاویر اور فحش گانوں سے محظوظ ہوتی ہیں اور ہمہ وقت ان کی سماعتوں سے نازیبا کلمات ٹکراتے رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں جب بچے دنیا میں آتے ہیں تو ان کے کانوں میں بھی وہی کلمات پیوست ہوتے رہتے ہیں، ان کو غیر شرعی کپڑے پہناتے ہیں تھوڑا بڑا ہوتے ہی تعلیم اور جدیدیت کے نام پر انہیں الحاد کے حوالے کر دیتے ہیں۔

جس عمر میں بچوں کو اسلام کی تعلیمات کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ اور اس کے رسولؐ سے روشناس ہونا تھا، اس عمر میں بچوں کو صلیبی تعلیم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ جو بچہ یا بچی رحمِ مادر سے ہی قرآن کی آواز سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے واقعات سے دور رہا ہو اس سے آپ کیا امید کر سکتے ہیں۔ جس کی پرورش ہی ہم نے الحاد کے سائے میں کی ہے اس سے ہم امید ہی کیا کر سکتے ہیں۔ آج مسلم معاشرے کی لڑکیاں ہندوؤں سے یونہی شادی نہیں کر رہیں ہے بلکہ یہ ہماری تربیت کا اثر ہے۔ اس ارتدادی فتنے کا سدباب کیسے ممکن ہے تو اس مسئلے کا حل تب ہی ممکن ہے جب ہم اپنی نسلِ نو کی تربیت روزِ اول سے ہی شروع کر دیں۔ اپنی عورتوں مردوں کو اسلام کے ابتدائی اصولوں سے روشناس کرائیں، اس کے لیے بڑے بڑے پروگرام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے ہمیں اس علاقے کا مشاہدہ کرنا ہو گا جہاں ہم اصلاحی کام کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنا ہو گا۔ وہاں کی ضرورتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ارتداد کی لہر زیادہ تر مخلوط تعلیم گاہوں میں نظر آتی ہے، اس کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔ اتنا ہی نہیں، معاشرے کے بچوں اور بچیوں کے لیے مخلص ہو کر ان کی اصلاح کرنی ہو گی۔ ان کی خامیوں کا مذاق نہیں بنانا ہو گا تب جا کر ہم ایک صالح معاشرے کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

با کردار لڑکی

عفت خان

طلال خان مردانہ وجاہت سے بھرپور سرخ و سفید نوجوان تھا جس پر یونانی دیوتا کا گمان ہوتا تھا۔
لاکھوں دلوں کی دھڑکن طلال خان کا سیل فون ہمہ وقت مختلف قسم کی لڑکیوں کے پیار بھرے چیٹ اور پکچرز سے بھرا ہوتا لیکن طلال خان ناک پر مکھی بٹھانے کو تیار نہ تھا۔
والدین سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے کہ بیٹا شادی کر لو، ہماری اکلوتی اولاد ہو، جس لڑکی پر ہاتھ رکھو گے ہم عزت سے بیاہ کر لائیں گے لیکن طلال خان کی نہ، ہاں میں نہیں بدل رہی تھی۔
ایک دن طلال خان سوچوں میں گم صم محوِ استراحت تھا کہ سیل فون پر ایک میسج موصول ہوا کہ آپ "طلال خان ہو؟"
"جی! آپ کون؟"
طلال خان نے مختصر جواب دیا اور اسی کے ساتھ اگلا میسج موصول ہوا کہ میں گلال ہوں سنا ہے آپ ماہرِ نفسیات ہیں۔ "کیا آپ میری الجھن سلجھا سکتے ہیں؟"
"جی ضرور، مسئلہ بتائیں۔"
طلال خان نے جواباً میسج کیا اور گلال کو بھی عام لڑکیوں کی طرح سمجھا کہ میرے حسن و ذہانت پر یہ بھی مر مٹنے والی ہو گی۔

لیکن گلال مضبوط کردار کی دو ٹوک بات کرنے والی لڑکی تھی مگر بذلہ سنجی اور مزاج کی شوخی لفظ لفظ سے ٹپکتی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے طلال خان کے دل میں دبے پاؤں داخل ہو گئی اور طلال خان ششدر رہ گیا کہ یہ کیسے اور کب ہوا۔۔۔۔!
آخرکار طلال خان ایک دن اظہارِ محبت کر بیٹھا، دل کی بے تابیاں چیٹ کی صورت گلال کو بیان کرتا گیا کہ ایک پک بھیجو!
وائس کرو!
کال کرو!
تاکہ کچھ تو دل کو قرار ہو۔
گلال ہنس کر ٹال جاتی کہ میری غیرت کے منافی ہے کہ میں کسی نامحرم کو آواز سناؤں یا پک بھیجوں۔
ہاں! میں شادی کروں گی مگر اس شخص سے جو میرے گھر باعزت طریقے سے رشتہ لائے اور رو برو مجھ سے ایک ملاقات کر لے جس کی اجازت شریعت نے بھی دی ہے۔
طلال خان کو ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔ اس نے ماں کے کمرے کی طرف رخ کیا، یہ خبر سنانے کے لیے کہ:
ماں! آپ کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔

اردو زبان سے دوری

لاریب فاطمہ

زبان کسی بھی قوم کی ثقافت کا ایک اہم جزو ہوتی ہے۔ زبان ہی کے ذریعے انسان اپنے جذبات و احساسات سے دوسروں کو آگاہ کرتا ہے اور دوسروں کے خیالات جاننے کے قابل ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کے اتحاد و استحکام کے لیے زبان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ زبانوں کا اختلاف ہی دو اقوام کی ثقافت کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں مختلف زبانیں رائج ہوں، اس میں عوام کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی زبان ہو جسے بطور قومی یا سرکاری زبان استعمال کیا جا سکے۔ "قومی زبان سے اہم کوئی چیز نہیں جو افراد کے درمیان یکجہتی پیدا کرے"۔

اگر ہم پاکستان کی تاریخ کو دیکھیں تو پاکستانی راہنماؤں نے یہ بات واضح کی ہے کہ قومی زبان کے بغیر اتحاد نا ممکن ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد قائدِاعظم نے اردو ہی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا۔ آپ نے فرمایا: "ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کوئی کام کر سکتی ہے۔ جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے تو وہ صرف اردو ہے"۔ اس طرح ڈھاکہ میں 1948 میں فرمایا: "اگر پاکستان کے مختلف حصے متحد ہو کر ترقی کی راہ پر گامزن ہونا چاہتے ہیں تو انہیں ایک سرکاری زبان اپنانا ہو گی اور میرے نزدیک وہ زبان اردو اور صرف اردو ہے"۔

یعنی اگر ہمیں ترقی کی راہ پر چلنا ہے تو وہ بھی بس قومی زبان کی بدولت ممکن ہے ورنہ نہیں۔ زبان انسان کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر شخص کو اپنی زبان سے بے حد پیار ہوتا ہے، وہ اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ مگر ہمیں کیسا پیار اردو سے، کیسی قربانی اردو کے لیے، کیا یہ اردو کے لیے قربانی ہے کہ ہم انگریزی زبان کی غلامی کریں۔ اردو زبان ہمارے آبا و اجداد کا ایک قیمتی تحفہ تھا جس سے آج ہم بہت دور ہو چکے ہیں اور انگریزی زبان کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جا چکے ہیں۔

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

مگر آج کے دور میں بزرگوں کو یہ ہی شکایت ہے:

میرے بچوں میں ساری عادتیں موجود ہیں میری
تو پھر ان بد نصیبوں کو نہ کیوں اردو زبان آئی

ان بد نصیبوں کو آخر کیوں اردو آئے جو کسی کے غلام بن کے بیٹھے ہوں۔ یہ تو وہ بچے ہیں جو اردو بولتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور انگریزی بولتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جو گفتگو میں انگریزی کے دو چار الفاظ استعمال نہ کریں تو ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ یہ تو وہ بچے ہیں جو اردو میں اپنے دستخط کرنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہیں۔

اردو زبان سے دوری

لاریب فاطمہ

اردو زبان سے دوری کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کے ہمارا حکمران طبقہ اپنے اور عوام کے درمیان فرق قائم رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم اداروں میں پڑھاتے ہیں اور برٹش یونیورسٹیز میں بھیجتے ہیں۔ جبکہ غریب عوام منہ کھولے دیکھتی رہتی ہے۔ اس طرح سرکاری نوکریوں پر بھی ان کی اجارہ داری ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی لوگوں نے اپنے بچوں کو انگلش میڈیم سکولوں میں داخل کروانا شروع کر دیا ہے اور جگہ جگہ انگلش میڈیم سکول کھل چکے ہیں۔ یوں ہی ان انگلش میڈیم سکولوں میں انگلش میڈیم اساتذہ بھی بچوں کو انگریزی زبان کی ہی اہمیت بتاتے ہیں۔ تو اسی طرح اردو زبان پست سے پست تر کا سفر کر رہی ہے۔ ان سب کو لگتا ہے کہ ہم بچوں کو انگریزی سکھا کر تہذیب و ثقافت سے آگاہ کر رہے ہیں مگر مختصر سی بات ہے۔

؎ کسے تہذیب کہتے ہیں، وہ خود ہی جان جائیں گے
تم اپنے بچوں کو فقط اردو سکھا دینا

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ ہمیشہ وہی اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ہوئیں جنہوں نے اپنی قومی زبان کی تکریم کی اور زندگی کے ہر شعبے میں اس سے استفادہ کیا۔ جرمنی میں جرمن زبان رائج ہے۔ روس میں روسی اور چین میں چینی زبان میں ہی تمام کام کیے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ چین کے صدر چواین لائی پاکستان تشریف لائے تو ان کے سامنے انگریزی میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے چینی زبان میں جواب دیا۔ "چین ابھی گونگا نہیں ہوا"۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کے چواین لائی صاحب انگریزی سے پوری طرح واقف تھے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے قومی زبان کو فوقیت دی۔ ایک ہمارے سیاسی رہنما ہیں کہ ہر جگہ انگریزی میں تقاریر کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ثابت کرتے ہیں ہم غلام ہیں۔ انہیں کیا پتا قومی زبان کی اہمیت۔

؎ اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا قرینہ سیکھو
سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

؎ ابھی تہذیب کا نوحہ نہ لکھنا
ابھی کچھ لوگ اردو بولتے ہیں

؎ سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

یہ جو چند کرنیں اردو بولتی ہیں انہیں چاہیے کہ اپنی محنت سے سورج بن جائیں، جو سدا چمکتا رہے اور ان کرنوں کو چاہیے کہ سب کو اردو کا مسافر کر دیں۔ تاکہ وہ جہاں سے بھی گزریں سلیقہ چھوڑ جائیں۔ تاکہ وہ بھی یہ کہنے کے قابل ہوں۔

؎ ہم ہیں تہذیب کے علمبردار
ہم کو اردو زبان آتی ہے

یومِ وفاعِ پاکستان

مروہ الطاف

جب 65 کی جنگ ہوئی تو قدرت
ہمارے سنگ ہوئی اور کفر پر رحمت تنگ ہوئی
جس کے نتیجے میں دشمن اپنے ناپاک ارادوں میں
کامیاب نہ ہوا۔

ہمت، جرأت اور بہادری ملے
پاکستانی عوام کے پرجوش لہو سے رقم ہونے والی
تاریخ کو یومِ دفاعِ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا
ہے۔ درحقیقت 6 ستمبر 1965ء کی جنگ بھی
کشمیر تنازعے کی ایک کسوٹی تھی۔ 6 ستمبر
1965ء کی ایک کالی اور اندھیری رات میں
ہمارا پڑوسی دشمن ہندوستان اپنے ناپاک ارادوں
کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ٹینکوں اور توپوں
کی فوجیں لے کر میرے ملک کی سرحدوں پر
حملہ آور ہوا۔ میرے دشمن کا خام خیال تھا کہ
وہ پاکستانی عوام کو حالتِ نیند میں دبوچ لے گا
اور ملکِ پاکستان کو فتح کر لے گا۔ اس کی خوب
تیاری وہ کر کے آیا تھا مگر ناکام رہا کیونکہ:

"دور کے ڈھول سہانے"۔

دشمن کو کہاں خبر تھی کہ ان بظاہر
کرچیوں کی طرح بکھرے لوگوں میں یعنی
اس ملک کے باسیوں میں اتنی شدید ہمت اور
جرأت ہو گی کہ وہ یکجا ہو کر اپنے دشمن کی
اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

وہ جانتا ہی نہ تھا کہ یہ وہ ملک
ہے جہاں کے باسی پچھلی راتوں کو اٹھ اٹھ
کر اپنے پروردگار کی بارگاہِ اقدس میں گڑگڑا
کر اپنے ملک کی سلامتی اور اپنے لیے
شہادت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

میرے وطن کے فوجی جوانوں کو
جب خبر ہوئی کی دشمن ہمارے ملک پر
چڑھائی کر دوڑے ہیں تو وہ نیند سے بیدار
ہوئے اور ہمت و بہادری کا لبادہ اوڑھا اور
دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ چونڈہ کے مقام پر
دنیا کا سب سے بڑا ٹینکوں کا قبرستان بنا
ڈالا۔ میرے وطن کے جیالے جوانوں نے
اپنی چھاتیوں پر بم باندھے اور ٹینکوں کے
نیچے لیٹ کر نہ صرف دشمن کے درجنوں
ٹینکوں کو تباہ کیا بلکہ ان کے حملے کو اپنی
عظیم الشان قربانیوں میں تبدیل کر دیا۔

شہادت کے لیے ہمہ وقت تیار
رہنے والے میرے وطن کے جانباز شاہین
اڑے اور 92 سیکنڈ میں دشمن کے 5 لڑاکا
طیارے نیست و نابود کر دیے اور ثابت کیا
کہ شیر چاہے سویا ہو یا زخمی ہو شیر، شیر
ہی ہوا کرتا ہے۔

یومِ وفاءِ پاکستان

مروہ الطاف

میرے وطن کے بہادر اور جانباز جیالے میجر عزیز بھٹی شہید جیسے بیسیوں نوجوانوں نے جذبہ شجاعت کے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ فضائے بدر کی یاد تازہ ہو گئی۔

میرے وطنِ عزیز کے ہر ایک سیارے میں اتنی ہمت، جرأت اور شعلے ہیں کہ اگر یہ بھڑک اٹھے تو پوری دنیا ایک آتش فشاں پہاڑ میں تبدیل ہو جائے گی۔

؎ توپ کیا چیز ہے بندوق کسے کہتے ہیں
ہم تو ٹینکوں کی صفیں چیر دیا کرتے ہیں

میرا دشمن چلا تھا میرا ملک فتح کرنے مگر میری قوم نے دشمن کے ایسے چھکے چھڑائے اور ان کے وار کو ناکام بنایا جس سے نہ صرف دشمن میدانِ جنگ سے فرار ہوا بلکہ اقوامِ متحدہ میں جان کی بھیک مانگنے جا پہنچا اور جنگ بندی کی اپیل کی اور جنگ بند ہو گئی۔

اس جنگ میں پاکستانی غیور اور بہادر عوام بھی اپنی افواج کے شانہ بشانہ سینہ تان کر کھڑی رہی اور دشمن کو مار بھگایا۔

بات 65 کی جنگ کی ہو یا 71 کی جنگ کی، ہندوستان کی ہر جنگ کے پیچھے ایک ہی چال رہی ہے کہ کسی طرح وہ پاکستان پر قابض ہو جائے مگر اللہ پاک کی مدد و نصرت اور افواجِ پاکستان کی ہمت، جذبے اور جنگی حکمتِ عملی نے اور پاکستانی عوام نے ہمیشہ ان کے ارادوں کو خاک کیا ہے۔

دشمن یہ نہیں جانتا کہ یہ وہ مسلمان ہیں جو دشمن سے کم جنگی مال و اسباب اور فوج ہونے سے نہ کبھی پیچھے ہٹے، نہ ڈرے اور نہ ہمت ہارے ہیں بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور فتح حاصل کر کے ہی رہتے ہیں۔ 65 کی جنگ میں پاکستانی عوام نے ثابت کیا کہ جو ہمت جنگِ بدر کے وقت مسلمانوں میں تھی وہ اب بھی پائی جاتی ہے بس آگ کے لیے اک چنگاری کی ضرورت ہوتی ہے۔

عاصم بخاری کی شاعری میں انگریزی الفاظ کا برتاؤ

مقبول ذکی مقبول

حسبِ معمول میں اپنی اس تحریر کا آغاز بھی عاصم بخاریؔ کے ہی ایک شعر سے کرنا چاہتا ہوں۔

؎ اپنا معمول ہے یہی عاصمؔ
نت نئے تجربے میں کرتا ہوں

عاصم بخاری کی شاعری کا اگر تحقیق و تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ان کے ہاں نت نئے شعری تجربے ملتے ہیں۔ کبھی یہ مقامی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو کبھی موضوعاتی، کسی نظم شعر میں ان کے ہاں موضوعاتی تجربے ہیں تو کبھی اسلوبیاتی تجربے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لسانی اور ہئیتی تجربہ کارے بھی ان کا روز کا معمول ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں جدید موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید الفاظ کا برتاؤ بھی ان کے وسیع ذخیرۂ الفاظ اور فنِ شعر پر ان کی مہارت کی خبر دیتا ہے۔ عاصم بخاری بیدار تخیل اور روشن خیال شاعر ہیں۔ جدید تقاضوں کے عین مطابق شعر کہتے ہیں۔
شعر ملاحظہ ہو:

؎ پگلے "ای لو" کا دور ہے اس میں
کون جسموں کی بات کرتا ہے

حالات سے بھی عاصم بخاری بے خبر نہیں ہوتے اور بدیسی زبان کے الفاظ کا بھی بڑی خوبصورتی سے برتاؤ کرتے ہیں۔

؎ یہ الگ کس، حوالے سے عاصمؔ
ذکر تو آیا "ریڈیو" کا بھی

عصری شعور بھی عاصم بخاری کے ہاں دیدنی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انگریزی الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال بھی کیا خوب ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو:

؎ پڑھ سکیں جس میں پر سکوں رہ کے
وہ علیحدہ نظام، ممکن ہے؟
کیا خواتین یونیورسٹی کا
دیس اپنے قیام، ممکن ہے؟

اسی مزاج کی نمائندگی کرتا ایک اور قطعہ پیشِ خدمت ہے:

؎ کیسے مناظر آئے ہیں آنکھوں کے سامنے
آسیں، امیدیں قوم کی سب خاک ہو گئیں
بیٹی نے یونیوسٹی میں پڑھنے کی بات کی
والد کی آنکھیں خوف سے نمناک ہو گئیں

اسی طرح ایک اور شعر میں برجستگی، مقامیت، منظر کشی کے ساتھ ساتھ انگلش کا استعمال بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

؎ دامن میں یہ کوہستاں کے "ڈگری کالج کالاباغ"
واقع پہلو میں چِغلاں کے "ڈگری کالج کالاباغ"

عاصم بخاری مشرقی مزاج کے حامل ہیں اور مغرب پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ صرف نظر رکھنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس پر کڑی تنقید بھی کرتے ہیں۔ قطعہ میں انگریزی لفظ کا روانی سے استعمال دیکھیے۔ ہم مغرب کی اندھی پیروی میں کیوں پڑ گئے جبکہ ہمارے ہاں اسلامی روایت اور مشرقیت ہے جس میں ماں باپ کا ہر لمحہ خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔

عاصم بخاری کی شاعری میں انگریزی الفاظ کا برتاؤ

مقبول ذکی مقبول

قطعہ ملاحظہ ہو:

؎ "یومِ فادر" رواج مغرب کا
ایسا مشرق میں تو نہیں ہوتا
دینِ فطرت میں سارے دن اس کے
باپ کا ایک دن نہیں ہوتا

عاصم بخاری کی نظر پوری دنیا پر ہے اور کائناتی منظر نامے پر وہ اپنی رائے بھی دیتے ہیں اور تجزیہ بھی پیش کرتے۔ اشعار دیکھیں:

؎ حادثے ذہن میں بری، بحری
ہر سو خوف و ہراس ایسا ہے
ٹائی ٹینک کا ذکر بھی اب تو
پر مکوڑے کو لگنے جیسا ہے

عاصم بخاری رویوں پر غور کرتے ہیں، مشرقیت تلاشتے ہیں، آدمیوں میں انہیں آدمیت کم اور عہدے، خود غرضیاں انہیں دکھائی دیتی ہیں کہ ہم انسان بننے کے لیے کوشش نہیں کرتے بلکہ عہدوں کے حصول کی تگ و دو میں زیادہ رہتے ہیں۔

؎ جاری ہے چار سو یہی بس اک مقابلہ
دنیا کو ایک بار دکھانا ضرور ہے
انساں اگر نہ بن سکے تو کوئی غم نہیں
بیٹے کو ڈاکٹر تو بنانا ضرور ہے

عاصم بخاری معاشرتی رویوں پر بھی کڑی نظر رکھتے ہیں اور شعر کے راستے سماج کو خبردار کرتے رہتے ہیں۔ شعر گوئی کا منصب بھی یہی ہے۔

؎ فیس بکی ہے دوستی عاصم
اس قدر اعتبار مت کرنا

عاصم بخاری کے ہاں جدت و قدامت کا بڑا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ بدیسی زبان کا لفظ کس نفاست سے استعمال کیا ہے۔ مگر قطعہ کے حسن کو بھی متاثر نہیں ہونے دیا بلکہ اس سے اس کا حسن دوبالا ہوا ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو:

؎ اچھی سروس ہے یہ مانا
جس نے بھی یہ جاری کی ہے
ہر اک کے کام آنے والی
شکراً "ون ون، ٹو ٹو" بھی ہے

عاصم بخاری کا مشاہدہ منظر کشی، مغربی طرز پر چوٹ اور انگریزی لفظوں کا استعمال۔ نظم کے اس ٹکڑے میں دیکھیے:

؎ ابھی یاں کوئی "ممی، ڈیڈی" نہیں
ابھی کہنے والے ہیں سب بابا جان
بزرگوں کا اس میں ابھی احترام
وہی پہلے والا، ابھی ہے مقام

اسی طرح ایک اور نظم میں جدت اور اندھا دھند تقلید و ترقی پر بھی ایک اور کے ٹکڑے میں تنقید برائے اصلاح غور و خوض اور انگریزی طرز و اصلاح کے انداز میں جدید انداز و موضوع دیکھیں۔

نظم: بیٹھکیں

؎ ابھی "نیٹ" یہ "یوز" کرتے نہیں
ابھی ایک دوجے سے ہیں باخبر
ابھی تک ہیں آباد یاں بیٹھکیں
ابھی لوگ مل بیٹھتے ہیں یہاں
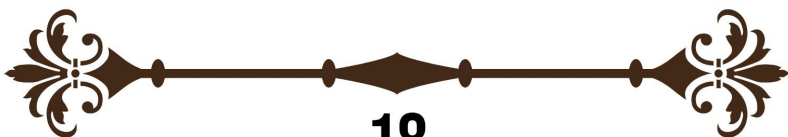
عاصم بخاری کی شاعری میں انگریزی الفاظ کا برتاؤ

مقبول ذکی مقبول

درج بالا نظم میں انگریزی الفاظ کا استعمال فطری، قدرتی اور بے ساختہ انداز میں انہوں نے کچھ اس مہارت اور روانی سے کیا ہے کہ نامانوسیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ ان کی شاعرانہ مہارت ہے۔

آخر پہ حالاتِ حاضرہ کے نمائندہ دو قطعات جن میں مہنگائی اور بجلی کے آئے روز بڑھتے نرخوں کے رونے کی تصویر کشی کے ساتھ انگریزی کے الفاظ کا غیر محسوس انداز میں برتاؤ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ قطعات ملاحظہ ہوں:

؎ دن بدن بڑھتے ریٹ یونٹ کے
دل کو ہر ایک تھام لیتا ہے
سب پہ بجلی سی ایک گرتی ہے
"بِل" کا جب کوئی نام لیتا ہے

؎ اور نہیں بس اک ہی سب کے
ارمانوں کا قاتل نکلا
صدمے سے مرنے والے کی
جیب سے "بجلی کا بل" نکلا
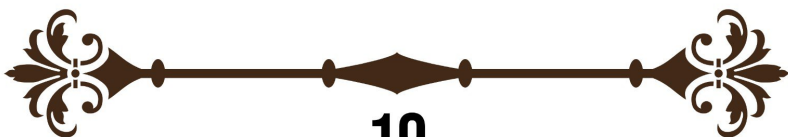
ویلیوز آف مائی سیلف

ستارہ منیر

ہم کیا ہیں؟ ہماری کیا اوقات ہے؟ اس طرح کے کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔

سب سے پہلے کہ ہم انسان ہیں ہم میں انسانیت ہے؟

احساسِ کمتری کا شکار لوگ کون ہوتے ہیں؟

ایسے لوگ جو خود پر یقین نہیں کرتے۔ ایسے لوگ جو خود کو بہت ہی کمزور سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ جو یقین اور امید سے خالی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جو احساسِ کمتری کا شکار ہو کر میل ملاپ سے دور رہتے ہیں۔

تو سب سے پہلی بات، اگر ہم خود کو اپنی ہی نظروں میں کمزور سمجھتے ہیں تو ہم کمزور ہی ہیں۔ اگر ہم خود پر یقین نہیں رکھتے تو ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم میل ملاپ نہیں رکھتے ہیں تو ہم بالکل ہی ختم ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے ہمارے اندر کانفیڈینس ہونا چاہیے، اگر نہیں ہے تو کانفیڈینس پیدا کریں۔ کہیں رش میں ہم جا رہے ہیں تو گھبرانا نہیں ہے، سب کو دیکھ کر بالکل بھی نہیں گھبرانا، کیوں؟ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو رش یا کچھ لوگوں میں جاتے ہیں تو خود کو احساسِ کمتری کا شکار کر لیتے ہیں۔ کسی کے کپڑے کسی کے جوتے دیکھ کسی اور کا کانفیڈینس لیول دیکھ کر تو یہ ہماری سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔

آپ خود کو نوٹ کریں کہ اگلے بندے میں ایسا کیا ہے جس نے مجھے کمزور بنا دیا ہے تو آپ بھی تو اس کی طرح بول سکتے ہیں آپ بھی اس کی طرح کچھ ایسا کر سکتے ہیں۔ کیوں؟ آپ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہماری سب سے بڑی بیماری ہے احساسِ کمتری کا شکار ہونا ہے۔ آپ کس چیز سے خود کو حقیر سمجھ رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کوئی چیز بھی حقیر نہیں ہے۔ بس خود کو اجاگر کرنے کی بات ہوتی ہے، جو ہمیں کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ ہماری کیا ویلیو ہے؟ یہ پہلے ہم نے خود اپنے اندر سے اجاگر کرنی ہے۔ ہم نے اپنے اندر کے اپنے بہادر ضمیر کو جگانا ہے۔ اگر ہم کوئی کام کر رہے ہیں تو اس کے لیے یہ نہیں ہے کہ ہم ماں کے پیٹ سے سیکھ کر آئے ہیں بالکل بھی ہم نے خود سیکھنا ہے۔ اگر ہم نے یہ مائنڈ بنا لیا ہے کہ نہیں مجھے یہ نہیں آتا تو پھر ہم کبھی نہیں سیکھ پائیں گے۔ آپ کا یقین پہلے ہے خود پر، اتنا یقین کہ میں یہ کر سکتا ہوں جب آپ خود پر ڈٹ جائیں گے، خود پر توجہ مرکوز کر لیں گے، خود پر یقینِ کامل کر لیں گے تو آپ ایک کامیاب انسان ہیں۔ کسی سے چھین کر یا ڈر کر آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ آپ کو مثبت سوچنا ہے اور خود پر یقین رکھنا ہے۔
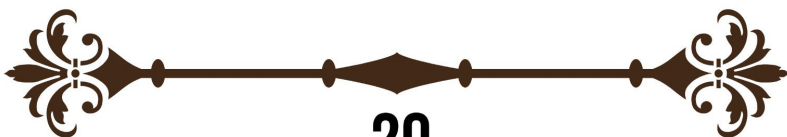
ویلیوز آف مائی سیلف

ستارہ منیر

کامیاب انسان: جب انسان اندر سے بہت زیادہ ٹوٹ جاتا ہے، خود کو سنبھال نہیں پاتا، کوئی راہ نہیں نظر آتی، دل چیختا ہے کہ کوئی دوسرا اس کی چیخ و پکار نہیں سن سکتا۔ اتنا چیختا ہے کہ آپ درد کی حالت میں ہیں، تکلیف کوئی دوسرا نہیں محسوس کر رہا ہوتا لیکن آپ خود تکلیف میں ہیں آپ کی سننے والا کوئی نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اگر آپ دوسروں کے ساتھ ہنس ہنس کر مل رہے ہوتے ہیں تو آپ دنیا کے کامیاب انسان ہیں۔ آپ نے صبر کیا، آپ خود سے لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تکلیفوں سے لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو آپ دنیا کے کامیاب ترین انسان ہیں۔ آپ لڑ سکتے ہیں تکلیفوں سے، صلاحیت ہے یہ آپ میں تو آپ کامیاب انسان ہیں۔ کامیابی انسان محنت سے حاصل کر سکتا ہے۔

یومِ دفاعِ پاکستان

مصدق احمد رانا

یومِ دفاع ہر سال 6 ستمبر کو پاکستان میں بطور ایک قومی دن منایا جاتا ہے۔ یہ دن پاک بھارت جنگ 1965ء میں افواج کی دفاعی کارکردگی اور قربانیوں کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد پاکستان کے دفاع اور عسکری طاقت کو مضبوط کرنے کی یاددہانی ہے تا کہ ہر آنے والے دن میں کسی بھی حملے سے بطریقِ احسن نمٹا جا سکے۔

اس دن سکولز، کالجز اور جامعات کے علاوہ سرکاری دفاتر میں 6 ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے شہداء اور غازیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے اور بھارت کے اس حملے کی پسپائی کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

ہر پاکستانی اپنی فوج کے دفاع پر فخر کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ پاک فوج ہر محاذ پر سرخرو ہے۔

6 ستمبر 1965ء کا دن عسکری اعتبار سے تاریخِ عالم میں کبھی نہ بھولنے والا قابلِ فخر دن ہے۔ جب کئی گنا بڑے ملک نے افرادی تعداد میں کئی گنا زیادہ لشکر اور دفاعی وسائل کے ساتھ اپنے چھوٹے سے پڑوسی ملک پر کسی اعلان کے بغیر رات کے اندھیرے میں فوجی حملہ کر دیا۔

اس چھوٹے مگر غیور اور متحد ملک نے اپنے دشمن کے جنگی حملہ کا اس پامردی اور جانثاری سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے سارے عزائم خاک میں مل گئے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی اسے شرمندگی اٹھانا پڑی۔ جارحیت کرنے والا وہ بڑا ملک ہندوستان اور غیور و متحد چھوٹا ملکِ پاکستان ہے۔

پاکستان نیوی: ستمبر 1965ء میں نیوی کی جنگی سرگرمیاں بھی دیگر دفاعی اداروں کی طرح قابل فخر رہیں۔ اعلانِ جنگ ہونے کے ساتھ بحری یونٹس کو متحرک و فنکشنل کر کے اپنے اپنے اہداف کی طرف روانہ کیا گیا۔ کراچی بندرگاہ کے دفاع کے ساتھ ساتھ ساحلی پٹی پر پٹرولنگ شروع کرائی گئی۔

پاکستان کے بحری، تجارتی روٹس کی حفاظت بھی پاکستان بحریہ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اس لیے سمندری تجارت کو بحال رکھنے کے لیے گہرے سمندروں میں بھی یونٹس بھجوائے گئے۔ یہ امر تسلی بخش ہے کہ پوری جنگ کے دوران پاکستان کا سامان تجارت لانے، لے جانے والے بحری جہاز بلا روک ٹوک اپنا سفر کرتے رہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی بحریہ کو بندرگاہوں سے باہر تک نہ آنے دیا۔

یومِ دفاعِ پاکستان

مصدق احمد رانا

پاکستان نیوی کی کامیابی کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کے تجارتی جہاز "سرسوتی" اور دیگر تو کتنے عرصہ تک پاکستان میں زیرِ حراست و حفاظت کراچی کی بندرگاہ میں رہے۔ 7 ستمبر کا دن پاکستان کی فتح اور کامیابیوں کا دن تھا۔ پاکستان نیوی کا بحری بیڑا، جس میں پاکستان کی واحد آبدوز پی این ایس غازی بھی شامل تھی۔ ہندوستان کے ساحلی مستقر "دوارکا" پر حملہ کے لیے روانہ ہوئی۔ اس قلعہ پر نصب ریڈار ہمارے پاک فضائیہ کے آپریشنز میں ایک رکاوٹ تھی۔ مذکورہ فلیٹ صرف 20 منٹ تک اس دوار کا پر حملہ آور رہا۔ توپوں کے دہانے کھلے اور چند منٹ میں دوار کا تباہ ہو چکا تھا۔ پی این ایس غازی کا خوف ہندوستان کی نیوی پر اس طرح غالب تھا کہ ہندوستانی فلیٹ بندرگاہ سے باہر آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ہندوستانی جہاز "تلوار" کو پاکستانی بیڑے کا سراغ لگانے کے لیے بھیجا گیا مگر وہ بھی "غازی" کے خوف سے کسی اور طرف نکل گیا۔
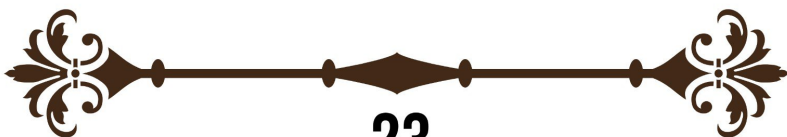
پنسلین

آمنہ یونس

پنسلین (انگریزی:Penicillin) مشہور دوا جو اکثر متعدی امراض کے دفعیہ کے لیے بہت مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ عموماً اس کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ بہت سی جلدی بیماریوں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔

الیگزینڈر فلیمنگ سنہ 1928ء میں انفلوئنزا کے موذی وائرس کو کنڑول کرنے کے طریقوں پر کام کر رہا تھا۔ پھر وہ دو ہفتے کی چھٹی پر چلا گیا۔ واپسی پر اس نے دیکھا کہ چھٹی پر جانے سے پہلے لیبارٹری کی جس ڈش میں اس نے بیکٹیریاز کلچر کیے تھے۔

اس ڈش پر پھپھوندی نے جم گئی تھی اور اس پھپھوند نے بیکٹیریاز کی افزائش روک دی تھی۔

فلیمنگ نے پھپھوند کی ماہیت پر تمام توجہ مرکوز کر دی۔ یوں پنسلین دریافت ہوئی اور اس دریافت سے اینٹی بائیوٹک انڈسٹری کا دروازہ کھل گیا۔

آسٹریلوی پیتھالوجسٹ ہاورڈ فلوری اور ان کی ٹیم نے پینسلین کو مستحکم کیا اور پہلا انسانی تجربہ کیا۔

امریکہ کی مالی اعانت سے پینسلین کو بڑے پیمانے پر تیار کیا گیا ۔اور دوسری جنگ عظیم کا رخ بدل دیا۔ اس کا استعمال ہزاروں فوجیوں کے علاج کے لیے کیا گیا تھا۔

پینسلین اور اس کی نسل کی ادویات ایک ہی حملے میں لاکھوں لوگوں کی ہلاکت کا باعث بننے والی بیماریوں کے خلاف انتہائی بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

تاہم ان کے وسیع پیمانے پر استعمال سے کچھ بیکٹیریا دیگر امراض کے علاج میں استعمال ہونے والی ادویات کو مؤثر نہیں ہونے دیتے۔

فلیمنگ کی انسانیت سے گہری محبت کا اس سے بڑھ کر اظہار کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے پینسلین کے حقوق اپنے پاس رکھ کر یا اسے فروخت کر کے مال بنانے سے گریز کیا۔

طبی شعبے میں اکثر جب وسیع تر انسانی اخلاقیات کا ذکر ہوتا ہے ان کا یہ قول بقول مثال پیش کیا جاتا ہے کہ میں نے پینسلین دریافت کی اور انسانیت کی بھلائی کے لیے مفت دے دی۔

ٹائم میگزین نے جب بیسویں صدی کے 100 اہم ترین لوگوں کی فہرست میں اس عظیم شخص کو شامل کیا تو یہ جملہ لکھا کہ "اس دریافت نے تاریخ کا دھارا تبدیل کر کے رکھ دیا، فلیمنگ کو 1945 میں طب کے شعبے میں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔

ہجرتِ مدینہ اور غارِ ثور

افشین شہریار

جہاں تک ہجرتِ مدینہ کا تعلق ہے جو نبیِ پاکﷺ پر مکہ سے مدینہ جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم کر دی گئی۔ اس سے ہمیں زندگی میں اور بہت سے سبق ملتے ہیں۔ اس میں بہت سی مصلحتیں پنہاں ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اپنے ہی مخالف ہو جائیں اور زندگی بہت تنگ اور مشکل ہونے لگے تو اس وقت ہجرت کر جانا ہی بہتر ہے جیسا کہ سورۃ مزمل میں بھی کہا گیا ہے۔

ترجمہ: "ان کی باتوں پر صبر کریں اور خوبصورت دوری اختیار کریں۔"

اللہ تعالیٰ کا حکم آ پہنچا تھا اور آپﷺ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب مکہ سے روانہ ہوئے تو اپنے بستر پر رات کو حضرت علیؓ کو لیٹنے کی تاکید کی۔ حضرت علیؓ کے حوالے سے یہ سعادت ان کے لیے مخصوص تھی کہ اب وہ آپﷺ کے بستر پر سوئے۔ ان شخصیت کو یہ سعادت ملنی تھی ورنہ بسترِ رسالت پر سونے کی سعادت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا اہل حضرت علیؓ جیسی صاحبِ فراست شخصیت ہی ہو سکتی ہے۔ ان کی شخصیت، ان کی بہادری اس سعادت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس سعادت سے انھوں نے کیا فیض پایا۔

دوسری طرف آپﷺ کے ہمراہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے ہمراہ تھے۔ اس طرح یہ دو شخصیات آنے والے وقت کے لیے تیار ہوئیں یعنی حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ، غارِ ثور کا تین روزہ قیام، یارِ غار کی ترکیب کا باعث بنا۔

جب نبیِ پاکﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ ہجرت کے سفر پر روانہ ہوئے تو آپﷺ سورۃ یٰس کی یہ آیت تلاوت کرتے جا رہے تھے۔

وجعلنا من بینا ایدیھم سداً ومن خلفھم سداً فاغشینٰھم فھم لا یبصرون

آپﷺ کے ہاتھ میں مٹی تھی جو وہ ان دشمنانِ دین کے سروں میں ڈالتے جاتے تھے جنھوں نے آپﷺ کے گھر کا محاصرہ، آپﷺ کے قتل کی نیت سے کر رکھا تھا۔

اس کلام کی تاثیر اور برکت سے مخالفین میں سے کوئی بھی آپﷺ کو نہ دیکھ سکا اور آپﷺ وہاں سے آرام سے گزر گئے۔ راستے میں غارِ ثور میں قیام کیا، یہ قیام تین دن اور تین راتوں کا تھا، آپﷺ کے مخالفین، مشرکین و کفارِ مکہ، آپﷺ کی تلاش میں نکلے کیونکہ ان کو پتہ چل گیا تھا کہ بستر پر حضرت علیؓ موجود ہیں اور آپﷺ جا چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد کا ظہور مسلسل ہوتا رہا یہاں تک کہ آپﷺ غارِ ثور تک پہنچ گئے۔ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں پر سے ایک بڑی تبدیلی نے جنم لیا۔ ایک بڑی تبدیلی سے پہلے تھوڑا سا ٹھہراؤ ہوتا ہے جہاں پر نئے آنے والے وقت کے لیے نئی نئی حکمتِ عملی جنم لیتی ہے۔

یہاں پر غارِ ثور میں حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے داخل ہوئے اور غار کو اس قابل بنایا کہ آپﷺ کو اندر بلایا جا سکے تاکہ آپﷺ کے آرام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

ہجرتِ مدینہ اور غارِ ثور

افشین شہریار

تھوڑا سا غور کریں تو ایسا لگتا ہے کہ غار ایک ایسی جگہ ہے جہاں سکون سے تنہائی میں دنیا کے شور و غل سے آرام پا کر انسان اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول ہو جاتا ہے اور ایک مضبوط پناہ گاہ مل جاتی ہے۔

سورۃ کہف میں بھی غار والوں کے بارے میں یہی بتایا گیا ہے۔

اس سے پہلے نبی پاکﷺ کے لیے غور و فکر اور اللہ تعالیٰ سے رابطے کے لیے غارِ حرا میں وقت گزارنا اہم تھا۔ یعنی غارِ ثور عرفانِ ذات اور عرفانِ حق کا حوالہ ہے۔

غارِ ثور میں جب قیام کیا تو کفارِ مکہ آپ کی تلاش میں نعوذ باللہ آپﷺ کے قتل کے ارادے سے وہاں تک پہنچ گئے۔ یہ بھی ان کا کمال تھا کہ ان کو اس طرح سراغ رسانی کے علم سے بھرپور واقفیت تھی لیکن اللہ تعالیٰ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔ اللہ کے حکم سے غار کے آگے ایک مکڑی کا جالا تن گیا۔ کبوتر نے انڈے بھی دے دیے۔ اندازہ ہوا کہ اگر کوئی اندر گیا ہوتا تو مکڑی کا جالا تو نہ تنا ہوتا جس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے اور مکڑی کا جالا بنتا بھی وہاں پر ہے جہاں پر کوئی آبادی نہ ہو۔ مشرکینِ مکہ نے اندازہ لگایا کہ یہاں پر تو کوئی نہیں جا سکتا کیونکہ آگے مکڑی کا جالا بھی ہے اور کبوتری نے انڈے بھی دیے ہیں تو غار میں کوئی نہیں گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ شاملِ حال رہی اور اس سے یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے قرب جتنا زیادہ اختیار کر لیا جائے اس قدر ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ظاہر ہوتی ہے۔ اس تین روزہ قیام میں نبی پاکﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیٹی حضرت اسماءؓ کھانا کھانا پہنچاتی رہیں اور اللہ کی شان تھی کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔

یہاں پر ایک بہت ہی اہم پہلو یہ بھی نظر آتا ہے کہ جب نبیِ پاکﷺ نکلے تھے اور آپﷺ نے سورۃ یاسین کی آیت پڑھی اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے علاوہ غارِ ثور میں بھی ٹھہرے اور وہاں پر مکڑی کا جالا اور کبوتری کے انڈے وغیرہ بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے تو آپﷺ کا غارِ ثور میں تین دن، تین راتیں قیام کرنا کیوں ضروری تھا۔ اگر چاہتے تو اسی طرح نظروں سے اوجھل ہو کر سفر اختیار کر کے مدینہ پہنچا جا سکتا تھا۔

اصل میں یہ تین دن اور تین راتیں بڑی خاموشی سے حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ گزارنے بہت اہم تھے، وہ ان کے قریبی دوست تھے اور بلکہ یہیں سے یہ یارِ غار کا محاورہ رائج ہوا۔ ایسا دوست جس پر کوئی شک نہ کیا جا سکے، بھروسہ کیا جا سکے اور ایسا دوست زندگی کے سفر میں ساتھ ہونے کے لیے بہت ضروری ہے۔ ایسا دوست میسر ہو تو آپ دنیا کے بہت سارے مشن مکمل کر سکتے ہیں۔

یہ خاموشی اور سکون جس میں اور کوئی نہ ہو حضرت ابو بکر صدیقؓ نبیِ پاکﷺ کے ساتھ، یہاں سے وہ قلبی کیفیات اور روحانی استحکام ظاہر ہوا کہ مدینے کے لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی ہستی اہم ترین چٹان بن گئی۔

یہی کیفیاتی اور روحانی تربیت تھی جو غارِ ثور کے تین دن میں ہوئی کہ نبیِ پاکﷺ کے جانے کے بعد اٹھنے والے بہت سے فتنوں کو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کمال طریقے سے کچل ڈالا۔

یہی مضبوطی تھی جس نے ان کو خلیفۂ اول بنانے کے قابل کیا۔ اس لیے غور کیا جائے تو وہ غار صرف پناہ نہیں بلکہ اللہ سے رابطے کا استعارہ ہے۔

استاذ کی عظمت

مہوش حمید

ہ رہبر بھی، ہمدم بھی یہ غمخوار ہمارے
استاد، یہ قوموں کے ہیں معمار ہمارے

استاذ ایک ایسا چراغ ہے جو تاریک راہوں میں روشنی عطا فرماتا ہے۔ استاذ ایک ایسا پھول ہے جو اپنی خوشبو سے معاشرے میں امن امان اور محبت کی فضا کو برقرار رکھتا ہے استاذ ایک ایسا راہنما ہے جو انسان کو فرش سے اٹھا کر عرش پر لے جاتا ہے اور کامیابیوں کی طرف گامزن کرتا ہے۔

ہم دنیاوی اعتبار سے کوئی بھی چیز دیکھتے ہیں، دیکھنے کے بعد اس چیز کے بنانے والے (یعنی کارگر) کی طرف دھیان جاتا ہے جس سے بنانے والے کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم اپنے معاشرے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز اپنے ہی جیسے مرد و خواتین کو دیکھتے ہیں، ایسے ہی ہنرمند افراد کو دیکھتے ہیں کہ جو ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان سب عہدوں اور ہنرمندوں کے پیچھے ایک بہت بڑی ہستی موجود ہے جسے استاد کہتے ہیں۔

اساتذہ کرام کی عزت اور ادب و احترام کے بارے میں امیر المومنین شیر خدا سیدنا حضرت علی المرتضیٰؓ کا قول مشہور ہے۔فرماتے ہیں: "جس سے میں نے ایک حرف بھی سیکھ لیا اس نے مجھے اپنا غلام بنا لیا، وہ میرا محسن ہے"۔

رب العزت نے اپنی پیاری لاریب کتاب قرآن مجید میں پیغمبرِ انسانیت، معلمِ انسانیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے فرمایا: "اے ایمان والو! تم اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سے اونچا مت ہونے دو اور آپ ﷺ سے اونچی آواز میں بات نہ کرو، جیسے تم ایک دوسرے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو، کہیں ایسا نہ کہ تمہارے عمل برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو"۔ (الحجرات:)2۔ شاہ ولی اللہؒ اس آیت کریمہ کے بارے میں تفہیمات میں لکھتے ہیں، اپنے استاد کی آواز سے اپنی آواز اونچا کرنا صریحاً ناشائستگی ہے۔

استادِ محترم کے احترام کی ایک عظیم مثال دیکھیے ایک مرتبہ شاہ اسماعیلؒ شہید کے استاد سید احمدؒ شہید نے اپنے شیخ استاد محترم شاہ عبد العزیزؒ کے انتقال کی خبر کی تصدیق کے لیے اپنا ذاتی گھوڑا شاہ اسماعیلؒ شہید کو دے کر دہلی بھیجا کہ کیا واقعی ان کے استاد شاہ عبد العزیزؒ انتقال کر گئے ہیں، شاہ اسماعیلؒ شہید سارے راستے گھوڑے کی باگیں تھامے ہوئے پیدل ہی چلتے رہے اور گھوڑے کی اس زین پر بیٹھنے کی ہمت نہ کی جس پر ان کے استاد بیٹھا کرتے تھے۔ انہی شاہ اسماعیلؒ شہید کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے استادِ محترم کی موجودگی میں تقریر نہ کرتے تھے بلکہ خاموش بیٹھے رہتے کہ میرے استاد بیٹھے ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

استاذ کی عظمت

مہوش حمید

امام سفیان بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ: میرے باپ نے مجھے وصیت کی، پیارے بیٹے! بچپن کا زمانہ اب ختم ہوا، اب تم سنِ شعور کو پہنچ گئے ہو، اب پورے طور سے خیر کی طلب یعنی حصولِ علم میں لگ جاؤ اور ایک ضروری بات کہ اس راہ میں سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اہلِ علم (اساتذہ کرام) کی اطاعت و خدمت کی جائے۔ اگر تم ان کی اطاعت و خدمت کرو گے تو علم و فضل سے بہرہ ور ہو گے۔

امام حمادؒ بن سلیمان اپنے عہد کے بڑے محبوب اساتذہ میں سے تھے۔ ان کے ایک شاگرد امام ابو حنیفہؒ ہیں، ان کا گھر استاد کے گھر سے سات گلیوں کے فاصلے پر تھا لیکن شاگرد کا ادب و احترام دیکھیے کہ اپنے استادِ محترم کے گھر کی جانب کبھی پاؤں کر کے نہ سوتے کہ کہیں استادِ محترم کی توہین نہ ہو جائے۔ اسی طرح اگر بعض اوقات دورانِ درس و تدریس کبھی استاد محترم کا بیٹا آ جاتا تو امام ابو حنیفہؒ احترام میں کھڑے ہو جاتے۔

اساتذہ کرام، خواہ وہ دینی علوم سے آراستہ کرنے والے ہوں یا مختلف علوم و فنون سے آشنا کرنے والے ہوں، سبھی ادب و احترام کے لائق ہیں۔ دینی اور عصری علوم دونوں کی انسان کو ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے ان علوم و فنون سے آشنا کرنے والے اساتذہ کرام کا ادب و احترام کرنا بے حد ضروری ہے۔

اساتذہ کرام اپنے علم اور تجربے سے ایسے ایسے گر سکھا دیتے ہیں اور وہ کچھ پڑھا اور سمجھا دیتے ہیں کہ اگر خود انسان وہ سفر طے کر کے حاصل کرنے لگے تو اس کی زندگی کا کافی حصہ بیت جائے۔ آج انسانیت جہاں کھڑی ہے وہ اساتذہ کی راہنمائی اور ان کے تجربات اور ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں تک پہنچی ہے۔

اساتذہ کرام کے ادب و احترام کی ایک جھلک حدیث نبویﷺ سے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ایک مرتبہ امام الانبیاءﷺ کے پاس حضرت جبریلؑ آئے، انتہائی صاف ستھرے لباس میں ملبوس ہو کر۔ اس وقت حضرت جبریلؑ ایک انسان کے روپ میں تھے۔ آپ کے سامنے ادب و احترام سے دو زانو بیٹھ گئے اور آپﷺ سے ایمان، اسلام اور احسان کی بابت سوالات کرنا شروع کر دیے۔ گویا کہ حضرت جبریلؑ ایک شاگرد کی حیثیت سے آپﷺ کے پاس آئے اور ہمیں سمجھا گئے کہ جس سے علم حاصل کیا جائے اس کے سامنے ادب و احترام سے بیٹھا جاتا ہے۔

مگر بدبختی سے ہمارے معاشرے میں استاذ کے ادب احترام سے زیادہ احترام کسی کرپٹ سرکاری ملازم یا سیاستدان کا کیا جاتا ہے۔ یہ افاقی سچائی ہے کہ جس سماج نے اساتذہ کا احترام کیا، استاذ کی اہمیت کو جانا، اس نے کامیابی کی منزلیں طے کیں اور جس معاشرے نے استاذ کی عزت نہیں کی، ذلت و رسوائی اس کا مقدر بن گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں، آمین!

نیا قلم، نیا سویرا

خالد سیف اللہ

چرواہے کی حکیمانہ باتیں:

حضرت سیدنا نافعؒ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں حضرت سیدنا عبداللہؓ بن عمرؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کی ایک وادی میں گیا۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ گرمی اپنے جوبن پر تھی، گویا سورج آگ برسا رہا تھا۔ ہم نے ایک سایہ دار جگہ میں دسترخوان لگایا اور سب مل کر کھانا کھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے قریب سے ایک چرواہا گزرا۔ حضرت سیدنا عبداللہؓ بن عمرؓ نے اس سے فرمایا: آیئے! آپ بھی ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمایئے"۔

چرواہے نے جواب دیا: "میرا روزہ ہے"۔

آپؓ نے اس سے فرمایا: "تو اس شدید گرمی کے عالم میں سارا دن جنگل میں بکریاں چراتا ہے، اتنی مشقت کا کام کرتا ہے اور پھر بھی تو نے نفلی روزہ رکھا ہوا ہے؟ کیا تجھ پر نفلی روزہ رکھنا ضروری ہے؟"۔

یہ سن کر چرواہا کہنے لگا: کیا وہ وقت آ گیا جن کے بارے میں قرآن پاک میں فرمایا گیا:

كلوا واشربوا هنيأ بما اسلفتم في الايام الخالية (سورۃ الحاقۃ: 24)

کھاؤ اور پیو مزے سے، ان اعمال کی وجہ سے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں آگے بھیجے۔

حضرت سیدنا عبداللہؓ بن عمرؓ اس چرواہے کی حکیمانہ باتیں سن کر بڑے حیران ہوئے

اور اس سے فرمانے لگے: "تم ہمیں ایک بکری فروخت کر دو، ہم اسے ذبح کریں گے اور تمھیں بکری کی مناسب قیمت بھی دیں گے"۔ آپؓ کی یہ بات سن کر چرواہے نے کہا: "حضور! یہ بکریاں میری ملکیت میں نہیں، بلکہ یہ میرے آقا کی ہیں۔ میں تو غلام ہوں، میں کیسے فروخت کر سکتا ہوں؟"۔ آپؓ اس کی امانت داری سے بہت متاثر ہوئے اور ہم سے فرمایا: "یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ چرواہا ہمیں بکری بیچ دیتا اور جب اس کا آقا پوچھتا تو جھوٹ بول دیتا کہ بکری کو بھیڑیا کھا گیا لیکن دیکھو یہ کتنا امین، متقی چرواہا ہے"۔

چرواہے نے بھی یہ بات سن لی اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا: "اگرچہ میرا آقا مجھے نہیں دیکھ رہا لیکن میرا پروردگار تو مجھے دیکھ رہاہے۔ میرا رب تو میرے ہر ہر فعل سے باخبر ہے"۔ حضرت سیدنا عبداللہؓ بن عمرؓ اس چرواہے کی باتوں اور نیک سیرتی سے بہت متاثر ہوئے اور آپؓ اس چرواہے کے مالک کے پاس پہنچے اور نیک چرواہے کو خرید کر آزاد کر دیا اور ساری بکریاں بھی خرید کر اس چرواہے کو ہبہ کر دیں۔

وہ ہستی جسے تم ارزاں سمجھتے ہو

سعدیہ ناز

اللہ نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسے اکیلا نہیں چھوڑا، اسے اس بھری دنیا میں بے آسرا نہیں چھوڑا بلکہ اسے ماں باپ جیسی عظیم نعمت دی جو اس کی پرورش کریں، اس کی تربیت کریں، اسے اچھے اور برے کا فرق بتلائیں تاکہ معاشرے میں ایک اچھا انسان پروان چڑھے۔ ایک بچے کی پہلی درسگاہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے، وہ وہی سیکھتا ہے جو اسے اس کی ماں سکھاتی ہے، اس کی تربیت کرتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بچے کو ایک اور انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے علم کی نعمت سے روشناس کرا سکے، جو اس کی شخصیت کو نکھار سکے، اس کو اخلاقی زیور سے آراستہ کر سکے، اسے مختلف فنون سے آگاہ کر سکے، اس انسان کو عام الفاظ میں "استاد" کہتے ہیں۔

استاد صرف ایک نام نہیں بلکہ ایک پہچان ہے، ایک چراغ ہے بھٹکے ہوئے کو راہ دکھانے کا، ایک شمع ہے جہالت کے اندھیرے کو مٹانے کی۔

یہ ایک ایسی شخصیت ہے جو انتہائی عزت و مقام کی حقدار ہے۔ دنیا کے ہر کامیاب شخص کے پیچھے اس کے ماں باپ کے ساتھ ساتھ اس کے استاد کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ہوں، انجینئر ہوں، پائلٹ ہوں خواہ کسی بھی شعبے سے ہوں، یہ اس وقت ہی ممکن ہو سکا جب انہیں استاد کی راہنمائی ملی، جب انہیں ان کے اساتذہ نے ترقی کی راہیں دکھائی۔

کوئی بھی انسان پیدائشی طور پر علم سیکھ کر نہیں آتا بلکہ استاد جیسی ہستی اسے علم کی روشنی سے شناسا کر کے اسے معاشرے میں ایک مقام پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اگر استاد کو روحانی ماں باپ کا درجہ دیا جائے تو غلط نہیں ہو گا کیونکہ اگر والدین سے اولاد کا خونی رشتہ ہے تو استاد کا اپنے شاگرد سے علم کا رشتہ ہے، احساس کا رشتہ ہے، روحانیت کا رشتہ ہے۔ عزت و احترام کا رشتہ ہے اور یہ عزت و احترام استاد کا حق ہے جو ہر شاگرد پر فرض ہے کیونکہ وہ کوئی عام انسان نہیں ہے بلکہ استاد تو وہ ہستی ہے جو ہمیں ایک اچھا اور باشعور انسان بناتی ہے، جو ہمیں اپنی اولاد کی طرح محبوب رکھتی ہے، جو ہماری کامیابوں پر ہمارے والدین کی طرح ہی خوش ہوتی ہے تو ہم کیوں اس کی عزت نہ کریں؟ کیوں اس کا احترام نہ کریں؟ کیوں اس سے عقیدت نہیں رکھیں؟

وہ ہستی جسے تم ارزاں سمجھتے ہو

سعدیہ ناز

لیلن نجانے کیوں ہماری نوجوان نسل اس عظیم انسان کے رتبے کو بھول گئی ہے، اس کے عزت و مرتبے کو فراموش کر گئی ہے، نجانے کیوں وہ اسے ایک عام انسان سمجھتی ہے، اس کی ڈانٹ کو اپنی بے عزتی سمجھتی ہے، اس کی مار کو تشدد سمجھتی ہے۔ مختصراً اسے اپنا دشمن گردانتی ہے جبکہ وہ اگر ڈانٹتا بھی ہے تو اس لیے تاکہ اسے دنیا کی ڈانٹ سے بچا سکے، اسے اس معاشرے میں رسوا ہونے سے بچا سکے، اس کی شخصیت کو معاشرے میں فخر کا باعث بنا سکے۔ اگر مارتا بھی ہے تو اس لیے تاکہ اسے اس بے رحم دنیا کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ وہ سختی بھی کرتا ہے تو اس لیے تاکہ اسے دنیا کے سخت لہجے نہ برداشت کرنے پڑیں۔ اس کی وقتی سختی دائمی سختیوں سے انسان کو بچاتی ہے۔

کسی بھی ملک کے فوجی اداروں میں جب نوجوانوں کو بھرتی کیا جاتا ہے تو انہیں جاتے ہی پھولوں کے ہار نہیں پہنائے جاتے، ان کو سخت ٹریننگ دی جاتی ہے۔ ان سے سخت رویے اختیار کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اس سختی سے مضبوط بنیں، ایک ایماندار اور ذمہ دار شخص بنیں۔

وہ اس وقتی سختی سے مستقبل میں اپنے وطن کے ایماندار محافظ بنیں اور دشمنوں سے اپنے ملک کو بچا سکیں۔

پھر یہی نوجوان اپنے استاد کی محنت اور سختیوں کی بدولت ملک و قوم کے لیے باعثِ فخر بنتے ہیں۔ کوئی غازی بن کر ملک کا نام روشن کرتا ہے تو کوئی شہادت جیسی موت پا کر قوم کی حیات بن جاتا ہے۔ کسی نے کیا خوب لکھا ہے:

"جو شخص استاد کی سختیاں برداشت نہیں کر سکتا اسے پھر زمانے کی سختیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں"۔

ہر انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی عزت اور احترام کرے اور ان کی باتوں کو، ان کی نصیحتوں کو غور سے سنے، ان سے عقیدت و محبت رکھے اور نہ صرف طالبِ علمی کے زمانے میں بلکہ عملی زندگی میں آنے کے بعد بھی اپنے استاذہ سے روابط قائم رکھے، ان سے ملے اور ان کی قیمتی دعاؤں سے فیضیاب ہو۔ یاد رکھیں کہ آپ کے ترقی میں آپ کے استاد کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی محنت ہی کی بدولت آپ ترقی کی راہ پہ گامزن ہیں۔

وہ شخص زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکتا جو اپنے والدین اور اساتذہ کی عزت اور ان کی نصیحتوں پر عمل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ میرے تمام اساتذہ کو صحت و سلامتی کے ساتھ رکھے اور ان کو ان کی محنت و مشقت کا اجر عطا کرے۔ آمین!

مولانا رومی

عائشہ شاہد

رومی 1207ء میں پیدا ہوئے، مشہور فارسی شاعر تھے۔ مثنوی، فیہ ما فیہ اور دیوان شمس تبریز (یہ اصل میں مولانا کا ہی دیوان ہے لیکن اشعار میں زیادہ تر شمس تبریز کا نام آتا ہے اس لیے اسے انہی کا دیوان سمجھا جاتا ہے) ان کی معروف کتب ہیں۔ آپ دنیا بھر میں اپنی لازوال تصنیف مثنوی کی بدولت جانے جاتے ہیں، ان کا مکانِ پیدائش ایران میں ہے اور ان کا مزار ترکی میں واقع ہے۔ اصل نام محمد ابن محمد ابن حسین حسینی خطیبی بکری بلخی تھا اور آپ جلال الدین، خداوندگار اور مولانا خداوندگار کے القاب سے نوازے گئے۔ لیکن مولانا رومی کے نام سے مشہور ہوئے۔ جواہر مضئیہ میں سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا ہے: محمد بن محمد بن محمد بن حسین بن احمد بن قاسم بن مسیب بن عبداللہ بن عبد الرحمن بن ابی بکرن الصدیق۔ اس روایت سے حسین بلخی مولانا کے پردادا ہوتے ہیں لیکن سپہ سالار نے انہیں دادا لکھا ہے اور یہی روایت صحیح ہے۔ کیونکہ وہ سلجوقی سلطان کے کہنے پر اناطولیہ چلے گئے تھے جو اس زمانے میں روم کہلاتا تھا۔ ان کے والد بہاؤالدین بڑے صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے۔ ان کا وطن بلخ تھا اور یہیں مولانا رومی 1207ء بمطابق 6 ربیع الاول 604 ہجری میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم کے مراحل شیخ بہاؤالدین نے طے کرادیے اور پھر اپنے مرید سید برہان الدین کو جو اپنے زمانے کے فاضل علماء میں شمار کیے جاتے تھے مولانا کا معلم اور اتالیق بنا دیا۔ اکثر علوم مولانا کو انہی سے حاصل ہوئے۔ اپنے والد کی حیات تک ان ہی کی خدمت میں رہے۔ والد کے انتقال کے بعد 639 ہجری میں شام کا قصد کیا۔ ابتداء میں حلب کے مدرسہ حلاویہ میں رہ کر مولانا کمال الدین سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ مولانا رومی اپنے دور کے اکابر علماء میں سے تھے۔ فقہ اور مذاہب کے بہت بڑے عالم تھے لیکن آپ کی شہرت بطور ایک صوفی شاعر کے ہوئی۔ دیگر علوم میں بھی آپ کو پوری دستگاہ حاصل تھی۔ دورانِ طالب علمی ہی پیچیدہ مسائل میں علمائے وقت مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے۔ شمس تبریز مولانا کے پیر و مرشد تھے۔ مولانا کی شہرت سن کر سلجوقی سلطان نے انہیں اپنے پاس بلوایا۔ مولانا نے درخواست قبول کی اور قونیہ چلے گئے۔ وہ تقریباً 30 سال تک تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔ جلال الدین رومی نے 3500 غزلیں 2000 رباعیات اور رزمیہ نظمیں لکھیں۔ درویش احمد چشتی ٹوپاری مولانا کے دو فرزند تھے، علاؤالدین محمد، سلطان ولد علاؤ الدین محمد کا نام صرف اس کارنامے سے زندہ ہے کہ انہوں نے شمس تبریز کو شہید کیا تھا۔

مولانا رومی

عائشہ شاہد

سلطان ولد جو فرزندِ اکبر تھے، خلف الرشید تھے، گو مولانا کی شہرت کے آگے ان کا نام روشن نہ ہو سکا لیکن علومِ ظاہری و باطنی میں وہ یگانہ روزگار تھے۔ ان کی تصانیف میں سے خاص قابل ذکر ایک مثنوی ہے، جس میں مولانا کے حالات اور واردات لکھے ہیں اور اس لحاظ سے وہ گویا مولانا کی مختصر سوانح عمری ہے۔ مولانا کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ ان کے فرقے کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ چونکہ مولانا کا لقب جلال الدین تھا اس لیے ان کے انتساب کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا ہو گا۔ لیکن آج کل ایشیائے کوچک، شام، مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقے کو لوگ مولویہ کہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل بلقان، افریقہ اور ایشیا میں مولوی طریقت کے پیروکاروں کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی۔ یہ لوگ نمد کی ٹوپی پہنتے ہیں جس میں جوڑ یا درز نہیں ہوتی، مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ باندھتے ہیں۔ خرقہ یا کرتا کی بجائے ایک چنّٹا دار پاجامہ ہوتا ہے۔ ذکر و شغل کا یہ طریقہ ہے کہ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینے پر اور ایک ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص شروع کرتا ہے۔ رقص میں آگے پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں۔ سماع کے وقت دف اور نے بھی بجاتے ہیں۔ بقیہ زندگی وہیں گزار کر تقریباً 66 سال کی عمر میں سن 1273ء بمطابق 672 ہجری میں انتقال کر گئے۔

مزار مولانا روم ایک میوزیم کی صورت میں موجود ہے جس کا رقبہ 18000 مربع میٹر ہے جو درگاہ حضرت مولانا، مسجد، درویشوں کے کمرے، لائبریری، تبرکات کے کمرے، سماع ہال، مطبخ، وسیع لان، صحن، باغیچہ اور دفاتر پر مشتمل ہے۔ مولانا میوزیم روزانہ صبح 9 بجے سے شام 6 بجے تک بغیر وقفہ کے کھلا رہتا ہے اور اس میں داخلے کے لیے ٹکٹ لینا ضروری ہے۔ قافلہ سالار عشق حضرت مولانا جلال الدین رومی نے شہر قونیہ (ترکی) کو اپنا دائمی مسکن بنایا جو ترکی کے مشہور تاریخی شہر استنبول سے 665 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت مولانا رومی فرماتے ہیں کہ: قونیہ شہر کو ہم نے مدینۃ الاولیاء کا لقب دے دیا ہے۔ اس شہر میں ولی پیدا ہوتے رہیں گے۔ ترکی کے اسی خوبصورت و دلکش شہر میں حضرت مولانا جلال الدین رومی کا مزار مبارک موجود ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی کا مزار مبارک خوبصورت و دلکش اور ڈیزائن کے لحاظ سے ایک منفرد مزار مبارک ہے، ظاہری خوبصورتی اور جاہ و جلال کے علاوہ انوار و تجلیات کے بھی کیا کہنے۔ حضرت مولانا روم کے مزار مبارک کے ایک حصہ میں شیشے کی ایک الماری میں حضرت مولانا روم کے تبرکات محفوظ ہیں جن میں حضرت مولانا روم کا لباس مبارک، حضرت مولانا کی جائے نماز، کندھے پر ڈالنے والا رومال، مولانا کی تین ٹوپیاں اور دو عدد جبے سر فہرست ہیں۔

مولانا رومی

عائشہ شاہد

قونیہ میں ان کا مزار آج بھی عقیدت مندوں کا مرکز ہے۔ ان کے 800 ویں جشنِ پیدائش پر ترکی کی درخواست پر اقوامِ متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، ثقافت و سائنس یونیسکو نے 2007ء کو بین الاقوامی سالِ رومی قرار دیا۔ اس موقع پر یونیسکو تمغہ بھی جاری کیا۔ 28 اکتوبر سے یکم نومبر 2007ء تک حضرت مولانا جلال الدین بلخی رومی کے 800 سالہ جشنِ ولادت کی تقریبات کے سلسلہ میں ایران میں پانچ روزہ عظیم عالمی کانگرس کا انعقاد ہوا جو دو روز تہران اور تین روز تک تبریز میں جاری رہی۔ کانگرس میں 30 ممالک کے تقریباً 80 اسکالر کے علاوہ کثیر تعداد میں ایرانی اسکالرز نے بھی شرکت کی۔ تہران میں اس عظیم کانگرس کا افتتاحی اجلاس بروز اتوار 28 اکتوبر 2007ء کو ایران کے صدر محترم جناب آقای محمود احمدی نژاد کی زیر صدارت تہران کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی ابتداء قرآن پاک کی آیات بینات سے ہوئی۔ کانگرس کے منتظم اعلیٰ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ صدر محترم نے اپنے طویل و مفید خطاب میں حضرت مولانا روم کی عالمگیر شخصیت اور ان کے فلسفۂ عشق پر جامع انداز میں روشنی ڈالی اور حاضرین و سامعین سے داد حاصل کی۔ استاد جلال ذوالفنون نے سہ تار پر مثنوی کے ابتدائی اشعار پیش کیے جس کے بعد افتتاحی اجلاس اختتام پزیر ہوا۔

30 اکتوبر 2007ء بروز منگل غیر ملکی مندوبین بذریعہ ہوائی جہاز حضرت شمش الدین تبریزی کے شہر تبریز روانہ ہوئے جہاں حضرت مولانا روم کے علاوہ حضرت شمس تبریزی کی یاد میں جشنِ شمس تبریزی کی تقریبات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تبریز کے گورنر نے اپنے صدارتی خطبہ میں حضرت مولانا روم اور حضرت شمس تبریزی کے بارے میں نہایت پر مغز گفتگو فرمائی اور اس اجلاس کا اختتام موسیقی کی تقریب سے ہوا جس میں ایرانی موسیقاروں نے موسیقی کے ساتھ مثنوی اور دیوانِ شمس کے اشعار پیش کیے۔ مذکورہ تقریبات میں پاکستان سے جسٹس جاوید اقبال، ان کی اہلیہ جسٹس ناصرہ جاوید اقبال، ڈاکٹر محمد اکرام شاہ، ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، ڈاکٹر محمد ناصر، ڈاکٹر عفان سلجوق، ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر خالدہ آفتاب، جناب افتخار احمد حافظ قادری اور مجلہ پیغام آشنا کے مدیر ڈاکٹر محمد سلیم اختر نے شرکت کی اور مقالات پیش کیے۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف "مثنوی مولانا روم" ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک مشہور کتاب "فیہ ما فیہ" بھی ہے۔ شعر دیکھیے:

؎ باقی ایں گفتہ آید بے زباں
در دلِ ہر کس کہ دارد نورِ جاں

ترجمہ: "جس شخص کی جان میں نور ہو گا اس مثنوی کا بقیہ حصہ اس کے دل میں خود بخود اتر جائے گا"۔

پنسلین کی ایجاد

سیدہ رابعہ

دنیا میں پانچ ایسی ادویات ہیں جنہوں نے نوعِ انسانی کو بے حد فائدہ پہنچایا اور لاکھوں لوگوں کو لقمہ اجل بننے سے بچایا۔ ان میں سے ایک کا نام "پنسلین" ہے۔ پنسلین کیا ہے؟ کیسے ایجاد ہوئی؟ اور کس طرح کام کرتی ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب جاننے سے پہلے ہمیں اس انسان کے بارے میں جاننا چاہیے جس کے سر پر اس ایجاد کا سہرا باندھا جاتا ہے۔ جی ہاں آپ لوگوں نے بالکل درست پہچانا میں "الیگزینڈر فلیمنگ" کی ہی بات کر رہی ہوں۔ پنسلین کی ایجاد الیگزینڈر فلیمنگ کا دنیا پر ایک طرح کا احسان ہے اور انسانیت سے گہری وابستگی اور ہمدردی کا منہ بولتا ثبوت بھی۔

الیگزینڈر فلیمنگ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا اور وہ ایک محنتی اور خودار کسان کا بیٹا تھا۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا مگر وسائل کی کمی کے باعث یہ کسی اچھے سکول میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اس کے باپ نے ایک بچے کی جان بچائی اور اس بات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ الیگزینڈر فلیمنگ کے دل میں انسانیت کے لیے جو محبت تھی وہ اسے اپنے باپ کو دیکھ کر پیدا ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان لاشعوری طور پر اپنے ارد گرد کے ماحول سے بہت کچھ سیکھتا ہے، خاص کر اپنے والدین اور بالخصوص باپ سے۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ وہ کسی رئیس کا بیٹا تھا اور رئیس شکریہ ادا کرنے کے لیے الیگزینڈر فلیمنگ کے گھر پہنچ گیا۔ مگر اس کے باپ نے کسی قسم کی مراعت لینے سے انکار کر دیا کہ اس نے یہ بچے کی زندگی صرف انسانیت کے جذبے کے تحت بچائی ہے۔ کافی اصرار کے باوجود جب کسان نہیں مانا تو رئیس جیسے ہی جانے لگا تو اس کی نظر الیگزینڈر فلیمنگ پر پڑی اور اس نے درخواست کی کہ اس بچے کی تعلیم کی ذمہ داری مجھے دے دیں۔ کسان اپنے بیٹے کی ذہانت سے واقف تھا اور رئیس کے اصرار کرنے پر کسان مان گیا اور الیگزینڈر فلیمنگ لندن کے ایک بہترین سکول میں تعلیم حاصل کرنے لگ گیا۔ اور اس نے اتنی محنت اور توجہ سے تعلیم حاصل کی کہ نہ صرف اپنے ماں باپ کا سر فخر سے بلند کیا بلکہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں پنسلین ایجاد کر کے بچائیں۔

پنسلین کی دریافت بہت توجہ طلب اور دلچسپ ہے۔ ایسا لگتا ہے قدرت اس کو پہلے بنا چکی تھی مگر ایک صحیح انسان کے ذریعے اس کی دریافت کروائی۔ جس نے خود اس بات کا اعتراف کیا کہ اس نے اس کو ایجاد نہیں کیا ہے، صرف دریافت کیا ہے۔

پنسلین کی ایجاد

سیدہ رابعہ

اب آتے ہیں کہ اس بات کی طرف کہ پنسلین آخر ایجاد ہوئی کیسے؟ پہلی جنگ عظیم میں سپاہی اتنا گولیوں سے نہیں مرے جتنا انفیکشن سے مر گئے تو دوسری جنگ عظیم میں عالمِ طب کو سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کوئی ایسی دوائی بنائی جائے جو صرف جراثیموں کو مارے مگر انسانی جسم کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔ الیگزینڈر فلیمنگ نے اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی اور پھر کہتے ہیں ناں، "جہاں چاہ، وہاں راہ" اور ایسا ہی الیگزینڈر فلیمنگ کے ساتھ ہوا۔

1928ء الیگزینڈر فلیمنگ اپنی ذاتی تجربہ گاہ میں سٹریپٹوکوکس جو کے بیکٹریا کی ہی ایک قسم ہے اس پر تحقیق کر رہا تھا اور ایسے ہی ان نمونوں کو لیبارٹری میں چھوڑ کر کسی کام سے کچھ دن کے لیے چھٹی پر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو ان نمونوں کو پھپھوندی لگ چکی تھی اور اس پھپھوندی کا نام پنسیلیم تھا جس نے بیکٹیریا کی افزائش کو روک دیا تھا۔ اور بس پھر امریکی اعانت سے پہلی دفعہ ایک ایسی دوا تیار کی گئی جو صرف جراثیموں پر اثر انداز ہوتی تھی انسانی خلیوں پر نہیں۔ اور اس دریافت نے دوسری جنگ عظیم کا رخ بدل دیا اور لاکھوں لوگوں کی جان بچانے میں معاون ثابت ہوئی۔

فلیمنگ نے اپنی ایجاد سے شہرت اور مال دونوں کمانے سے انکار کر دیا۔ مگر اس کی انسانیت کے لیے اس بے غرض محبت نے اسے بے ہر دلعزیز اور بے حد مقبول بنا دیا۔ پاکستانی انٹرمیڈیٹ حصہ دوم انگریزی کی کتاب میں الیگزینڈر فلیمنگ پر ایک سبق نصاب کا حصہ ہے جو دیگر ہیروز کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے اور یہ بات سچ ہے کہ جو لوگ انسانیت کو سب سے مقدم رکھتے ہیں بلاشبہ وہی یاد رکھنے کے حق دار ہیں۔

مولانا رومیؒ

سیدہ رابعہ

صوفی ادب سے دلچسپی رکھنے والے تمام لوگ تقریباً محمد جلال الدین رومیؒ کے نام سے واقف ہیں۔ 1207ء میں ایران میں پیدا ہونے والے فارسی کے مشہور شاعر لازوال مثنوی "مولانا روم" جس نے مولانا کو آج بھی زندہ و جاوید رکھا ہوا ہے کہ ایران میں کوئی بھی کتاب اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔ اس کتاب میں اشعار کی تعداد 26660 ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی ایک فارسی نثری تصنیف "فیہ ما فیہ" بہت مشہور ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اس کو شاہکار تصور کیا جاتا تھا۔ اور آپؒ کا دیوان "شمس تبریز" ہے جس کو شمس تبریز کے نام سے جوڑا جاتا ہے۔ درحقیقت آپ کی ہی تصنیف ہے، چونکہ اس میں زیادہ ذکر شمس تبریز کا تھا اس لیے لوگ مغالطے میں اسے شمس تبریز کی تصنیف سمجھ لیتے تھے۔

آپؒ نے ابتدائی تعلیم "سید برہان الدین" سے حاصل کی اور اپنے والد کی وفات تک ان کے پاس ہی رہے ان کی وفات کے بعد شام چلے گئے۔ آپؒ کو صوفی شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مولانا فقہ کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ دیگر علوم پر بھی آپ کو دسترس حاصل تھی۔ آپؒ شمس تبریز کو اپنا روحانی پیر و مرشد مانتے تھے۔

آپؒ کے دو فرزند تھے اور آپؒ کے ہی ایک فرزند نے شمس تبریز کو شہید کیا تھا۔ جن کو شمس الدین محمد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ بھی ایران کے مشہور صوفی بزرگ تھے اور مولانا روم کے استاد تھے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ کے فرقے کو ماننے والے لوگ آج بھی ہیں۔ وہ جلالیہ کہلاتے ہیں، مصر اور قسطنطنیہ میں ایسے لوگوں کو مولویہ کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا ایک خاص لباس ہوتا ہے۔ ایک لمبی ٹوپی جسے نمد کہتے ہیں، اس میں جوڑ نہیں ہوتا، کرتا اور چٹلا دار پاجامہ ہے، جسے پہن کر یہ لوگ ذکر کی غرض سے ایک ہی جگہ پر ایک ہاتھ سینے پر باندھ کر رقص کرتے ہیں۔ مولویہ فرقے کے کم و بیش 1 لاکھ سے زائد افراد افریقہ اور ایشیا میں پائے جاتے ہیں۔

شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ مولانا رومیؒ کو اپنا روحانی پیر مانتے تھے۔ صوفیاء کرام کی ذہنی وسعت کا اندازہ مولانا رومؒ کے ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ے آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو در نظر رو در نظر

مولانا رومیؒ

سیدہ رابعہ

علامہ محمد اقبالؒ نے ان اشعار کی وضاحت کچھ اس انداز میں کی ہے کہ:

؎ خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

آپؒ کے 800 ویں پیدائش پر یونیسکو نے 2007 کو بین الاقوامی رومی سال قرار دیا تھا۔ مولانا رومیؒ کی مثنوی کے تراجم جو آج کل اقوال کی صورت میں پڑھے جاتے ہیں اور کچھ منتخب اقوال درج ذیل ہیں۔ جن کو اگر سمجھ کر پڑھا جائے اور عملی زندگی میں لاگو کیا جائے تو حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور یہی صوفیاء کرام کا وصف رہا ہے کہ انسان کو اس کے اصل سے ملوانا تاکہ اس پر کائنات کے راز افشاں ہو سکیں۔

1۔ "کبھی سنا ہے انسان کو اس کی عاجزی لے ڈوبی ہو؟ انسان کو اس کا تکبر لے ڈوبتا ہے"۔

2۔ "جب تو اپنے خود غرض نفس پر قابو پا لے گا تب تیرے دکھ خوشیوں میں بدل جائیں گے"۔

3۔ "ہمیشہ سچ بولنے سے انسان کو ذہنی پریشانی سے نجات ملتی ہے"۔

4۔ "کم ظرف انسان دوسرے سے لیا ہوا ہیرا بھول جاتا ہے مگر اپنا دیا ہوا پتھر یاد رکھتا ہے"۔

5۔ "تم سمندر میں ایک قطرہ نہیں ہو، بلکہ تم ایک قطرے ہو جس میں پورا سمندر رہے"۔

6۔ "اپنے آپ کو چھوٹا نہ سمجھو تم بے خودی کے عالم میں خود ایک کائنات ہو"۔

7۔ "اے دل اگر تجھے دوزخ کی آگ سے نجات پانے کی فکر ہے تو رسول ﷺ کا قرب حاصل کر"۔

8۔ "خاموش رہو، صرف خدا ہی تمہارے دل کے بوجھ ہلکا کر سکتا ہے"۔

9۔ "روح اتنی قریب ہے کہ تم اس کو دیکھ نہیں سکتے، مگر اس تک پہنچ سکتے ہو"۔

10۔ "یاد رکھ جب تک تیرا عشق دنیا ہے تیرا مقام نہ بدلے گا"۔

11۔ "اندھیرا درختوں اور پھولوں کو آنکھوں سے چھپا سکتا ہے لیکن محبت کو روح سے نہیں چھپا سکتا"۔

12۔ "ایک طالب اور سالک کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر ناگواری کو برداشت کرے"۔

13۔ "جدائی صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو آنکھوں سے پیار کرتے ہیں، جو لوگ دل اور روح سے پیار کرتے ہیں ان کے لیے کوئی جدائی نہیں ہے"۔

14۔ "انسان جب کوشش کرتا ہے تو راہ ضرور پیدا ہو جاتی ہے اور انسان لامکاں کا راستہ پا لیتا ہے"۔

15۔ "جس جسم میں اللہ کے نور کا چھڑکاؤ نہیں ہے وہ اولیاء کے جسم کی صحبت کو برداشت نہیں کرتا ان سے نفرت کرتا ہے"۔

جبری گمشدگی

سیدہ رابعہ

جبری گمشدگی ایک ایسی گمشدگی ہے جس میں کسی شخص کو محض اپنی سوچ کی عدالت میں بنا کسی ثبوت کے مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور جبراً اس کو اٹھا کر کسی نا معلوم جگہ پر منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس میں بعض دفعہ ریاست کے ملکی عناصر اور غیر ملکی تنظیمیں شامل ہوتی ہیں۔

جن کا مقصد ملکی اور صوبائی استحکام میں خرابیاں پیدا کرنا اور علاقائی لوگوں کو لسانی بنیادوں پر توڑنا ہوتا ہے، جبری گمشدگی ایک حساس موضوع ہے۔ لوگ اس پر زیادہ بات نہیں کرتے ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس بات کا علم بھی نہیں اور جو اس بات سے آگاہ ہیں وہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ جو لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں فی الوقت ان کو بھی نہیں پتہ چلتا کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ ہمیں ہمارے کس گناہوں کی سزا ملی ہے۔

ایک آزاد ملک کے شہری ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ زبردستی کا معاملہ کیوں کیا جا رہا ہے اور رہی بات ان کے لواحقین کی وہ بھی اس سے بہت دیر بعد باخبر ہوتے ہیں۔ پاکستان میں جبری گمشدگی کوئی نئی بات نہیں ہے نا ہی ایسا ہے کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہے بس فرق یہ ہے کہ اس کے بارے میں آگاہی کی ضرورت ہے۔

لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کے درمیان موجود انسان اچانک سے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ گھر کے افراد اس سوچ میں گھلتے رہتے ہیں کہ نہ جانے ہمارا پیارا زندہ ہے یا کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ اپنی سوچ سے بار بار ٹکرانے کے بعد آخر کار تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں اور کچھ اسی کشمکش میں اپنی جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔

جبری گمشدگی کی وجوہات پر اگر بات کی جائے تو اس کی وجہ شک ہے اور بعض دفعہ کچھ ثابت نہ ہونے کی شکل میں قابض شخص کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ امن وامان کی سلامتی بتائی جاتی ہے۔ بات صرف اتنی سادہ نہیں ہے جتنی نظر آتی ہے۔ جبری گمشدگی ایک مکمل پلان کی صورت میں تشکیل دی جاتی ہے جس میں سب سے زیادہ نقصان ملک کا ہوتا ہے۔ صوبائی انتشار پیدا کیا جاتا ہے جس سے ملک دشمن عناصر کو تقویت ملتی ہے۔

پنجابی بلوچی تنازعہ اسی ظلم کی پیداوار ہے۔ پنجاب کے لوگ بھلے کتنے ہی ملنسار کیوں نہ ہوں بلوچ ان کو پسند نہیں کرتے اور یہاں تک کہ اگر کوئی پنجابی بلوچستان میں موجود ہو تو بعض دفعہ اس کو اپنی صوبائی شناخت چھپانی پڑتی ہے۔

جبری گمشدگی

سیدہ رابعہ

فیروز بلوچ، بلوچستان کے ضلع پنجگور سے تعلق رکھنے والے نوجوان کی راولپنڈی میں گمشدگی، جبری گمشدگی کا معاملہ ہے، جو کراچی یونیورسٹی میں خود کش حملے کے بعد سامنے آیا اور صرف ایک واقعہ نہیں متعدد افراد کی گمشدگی اس میں شامل ہے اور چونکہ اس میں بااثر لوگ شامل ہوتے ہیں تو قانون حرکت میں نہیں آتا اور انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا۔

فیروز بلوچ کے علاوہ ان گنت لوگ جبری گمشدگی کا شکار ہو چکے ہیں اور اس میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ "وائس آف مسنگ بلوچ" کے چیئرمن نصر اللہ بلوچ کا کہنا ہے کراچی دہشتگردی کے واقعے کے بعد 8 خواتین اور بچوں سمیت 21 افراد کی جبری گمشدگی کی شکایات درج ہوئی ہیں، جن میں 13 طالب علم ہیں، ان میں سے 4 افراد کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جبری گمشدگی کسی صورت بھی فائدہ مند نہیں ہو سکتی خاص طور پہ جب زیر تعلیم طالب علموں کے ساتھ کی جائے۔ اس کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے، ریاست اور عدلیہ اس میں اپنا کردار ادا کریں اور جبری گمشدگی کے شکار لوگوں کو بازیاب کرانے کے لیے احسن اقدام اٹھائے کیونکہ کوئی بھی ریاست عدل و انصاف کے بغیر صحت مندانہ طریقے سے نہیں چل سکتی۔

نوائے دل

محمد عمر فیاض

اس دورِ پُر فتن میں سب سے بڑی قیامت یہ ہے کہ جاہل اور ہوس پرور سیاست دانوں نے اپنے شیطانی جذبات کی آسودگی کی خاطر انفس و آفاق کی وحدت کو ایک دوسرے سے نفرت کرنے والی کثرت میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ فوج درندگی کے بل بوتے پر فتنے برپا کرنے والے اربابِ سیاست کا خیال ہے کہ دانائی اسی میں ہے کہ نادانوں کو ثقافت، لسان و اوطان اور ادیان و فرقہ میں الجھا کر چھوٹی چھوٹی برسرِ جنگ ٹولیوں میں منقسم کر دیا جائے اور پھر بڑے اطمینان کے ساتھ ان پر فرماں روائی کی جائے۔

ان مذہبی رہنماؤں، سیاستدانوں اور حکمرانوں نے انتہائی بد دیانتی کے ساتھ بین الاقوام کی ترکیب تراشی ہے۔ ہمیں زبان، فرقہ اور سیاست کی آویزشوں میں مبتلا کر کے پورے ملک کو جہنم بنا رکھا ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ یہ بانیانِ فساد خود تو سلامتی کے گوشوں میں بیٹھے بادۂ سرجوش کے جرعوں کا مزہ لے رہے ہیں اور فوج کو للکار رہے ہیں کہ وہ عیش و عشرت کے ہجوم میں غریب کے خون سے ہولی کھیلتے رہیں۔

جہالت کی لئے اس قدر بڑھ چکی ہے کہ خود بڑے بڑے تعلیم یافتہ افراد بھی اس دھوکے میں ہیں کہ ہم پاکستانی اور مسلمان ہونے کے ساتھ سنی شیعہ اور وہابی بھی ہیں۔ لیکن ان سادہ لوحوں کے ذہنوں میں یہ تصور اجاگر ہی نہیں ہوا کہ سب سے پہلے ہم ایک انسان ہیں بعد میں کچھ اور۔ پروپیگنڈا کی طاقت ہی تو ہے کہ دین و ملت کے چکر میں آ کر ہم اپنی انسانیت کو قطعاً فراموش کر چکے ہیں اور یہ دیکھ کر ہمیں بڑی بے پایاں حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کی اس اکائی میں سے، اعداد کا یہ جرار لشکر کہاں سے نکل پڑا۔ عینیت کے اس چشمۂ تر میں یہ غیریت کا زہر کس نے ملا دیا اور اس کعبۂ وحدت میں یہ شرک کیوں کر داخل ہو گیا۔

سرمایہ داری کا نظام ایک زبردست تن و توش کی جونک کی مانند، عامة الناس کی گردن میں منہ گاڑے بڑے مزے لے کر غریبوں کا خون چوس رہا ہے۔ اس منحوس نظام نے آنکھوں سے مروّت، لہجے سے نرمی، خیالات سے ہمدردی اور دلوں سے دھڑکنیں چھین لی ہیں۔ ان ہوس کاروں کو ٹھوس چٹانوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔

نوائے دل

محمد عمر فیاض

یقین جانیے کہ جب تک آدمی حجاج، ہلاکو، چنگیز اور یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر لیتا، سرمایہ دار اور صنعتکار نہیں بن سکتا۔ اس فریب میں نہ آجایئے گا کہ مزدوروں، کسانوں اور مفلسوں پر جو گزر رہی ہے، اس سے یہ غیور حکمران اور سیاستدان بے خبر ہیں، جی نہیں؛ ان کو سب کی دردمندیوں کا علم ہے اور یہ بھی جان رکھیں کہ وہ اس حالت پہ ترس کھانے کی بجائے، الٹا لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

جب ان کے دستر خوانوں پر مرغ و ماہی کی قابیں چنی جاتی ہیں، تو وہ اس تصور کو محسوس کرکے کھانوں کی لذت اور بھی بڑھا لیتے ہیں کہ اس وقت لاکھوں غریب روکھے سوکھے ٹکڑے کھا رہے ہوں گے، اور راتوں کو جب اپنے گرم ریشمی لحافوں میں لیٹ کر یہ سوچتے ہیں کہ اس وقت اللہ کے لاکھوں بندے فٹ پاتھ پر سردی سے اکڑ رہے ہوں گے تو ان کے لحافوں کی حدت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

اور جس وقت یہ ناداروں کو پھٹے پرانے لباس میں دیکھتے ہیں تو ان کے اطلس و کمخواب کے لباس کی نرمی ہزار چند بڑھ جاتی ہے۔ ان تمام بے شمار آفات کے ساتھ ساتھ، اللہ اللہ یہ نوجوان بیواؤں کی ٹوٹتی ہوئی چوڑیاں، یتیم بچوں کی شفقت تلاشتی آنکھیں، نادار بیماروں کی یہ ابھری ہوئی پسلیاں، ماؤں کی آغوش میں یہ پھول سے بچوں کے ڈھلتے ہوئے منکے اور بوڑھے باپوں کی کاندھوں پر بے انتہا بوجھ، مگر اس سب کے باوجود ایک ابدی سناٹا چھایا ہوا ہے، کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی۔ میرا بھی یہی عالم ہے مدت سے کسی مددگار کا انتظار کر رہا ہوں لیکن کسی کی چاپ سنائی نہیں دیتی، اے اتھاہ سناٹے! ہاں تُو ضرور بول رہا ہے اور میں سن رہا ہوں لیکن اسے زبان تک لانے کی جرات نہیں کر سکتا۔

شررِ فشاں

خ ا ملھی

یہ جون کی گرم تپتی شام تھی۔ ایک ایک دن، ایک ایک رات عذاب جیسا تھی۔ پسینہ شررِ فشاں کی سی لہروں کی طرح جسم سے ٹپکتا۔ گرمی نے تو نئی سہاگنوں کو بھی نہ چھوڑا، ان کے سروں سے بھی لال گھونگھٹ اٹھ گئے تھے، ان کی جگہ ہلکے رنگوں نے لے لی تھی۔ وہ بھی صبح صبح سر پر مٹکے اٹھائے کنویں کی طرف چل دیتی۔

دوپہر گئے تک ان کی باری بھی آہی جاتی شام اترے وہ گھر لوٹتی، جیسے پانی زمین کی تہیں پی گئی ہو۔ اوپر سے علاقہ بھی تھر کا شام زمین کو پگھلاتا نابناتی۔ ننھے طفل کے قدم پا زمین بوسگی کرتے کہ آبلے پڑ جاتے۔ تپش اپنی جگہ مگر آج کی صبح خیر کل کی شام سے کچھ الگ سے خاص تھی۔ کچھ شوخ لڑکیاں ہونٹوں میں آنچل دبائے ہنستی کھلکلاتی سروں پر مٹکے رکھے ایک دوسرے کو چھیڑتی کہنیاں مارتی چلتی جاتی۔

جھانجھر کی آواز دور تک الہڑوں کی ہنستی ہوئی زندگیوں کا پتہ دیتی۔ اتنے جدید دور میں تھر کے علاقے کا اتنا سا فائدہ ہوا کے بجلی کی سہولت میسر آ گئی تھی۔ مگر جب بجلی جاتی تو چار چار دن نہ آتی، آج کی خاصیت کی وجہ بھی یہی بنی کے پچھلے چار دن سے لائٹ غائب تھی، مگر زندگی انسانی فطرت کے عین مطابق چل رہی تھی۔

گھروں میں دیوں کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ چمنیوں کی کثیف چمک راستہ دکھاتی، بوڑھے لوگ درختوں کے نیچے حقے رکھے، گڑ گڑ گڑ کر رہے تھے۔ عورتیں بچوں کو حوصلے دیتی کبھی چھنکنے کے آر لگا کبھی مٹی کا برتن پکڑا کر کے چپ کرانے کی کوشش کراتی۔ حسب معمول پھیکی پھیکی لالٹینوں پر آٹے کی دھول اور تھاہ سے روٹی توے پر ڈالتی، چلھوں میں لکڑیاں دھونستی، دوپٹوں کے پلو پکڑے ادھر پسینے سے شرابور پیشانی صاف کرادھر پلو پھینک کر پیڑا بیلنے لگتی۔ ماہی ادھر پانی دے، سمی اچار لیتی آنا، ببلو پتّر روٹی کھالے۔ مائیں اپنے بچوں کے ذمے کام لگاتیں، گویا بڑھتی گرمی کے ساتھ ہی ان کے کام کی تیزی بھی بڑھتی جاتی۔ ادھر جوان بالیاں نامحرموں سے گھونگھٹ لٹکائے آنگنوں میں بھاگی پھرتی ہر ایک کی آواز پر دوڑی جاتی کہ ماتھے پر بل نہ آنے پاتا کیوں کے وہ تھر کے لوگ تھے جن کے خون میں صبر تو آٹے کی طرح گوندھ دیا جاتا ہے۔ سال دو سال کی سہاگنیں اپنے بچوں کی فکر میں اس گرمی کو نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔ بھاگی پھرتی کوئی مجازی خدا کو کھانا کھلانے کے ساتھ پنکھا جل رہی ہے تو کوئی، بچے کے بھوکے ہونے کی فکر میں بچے کو چوری دیتی پھرتی اور کوئی ساس کی ٹانگیں دبانے میں مصروف تھی۔

شرر فشاں

خ ا ملہی

نوجوان لڑکے بھی ان سے کم نہیں کوئی بتّی کا انتظام کر رہا تو کوئی مہرباں ماں کو پانی ڈھو کر لا دیتا تو کوئی بہن کو دیا جلا دیتا۔ کوئی یہاں اپنے بچے کو روٹی کھلا رہا کے اتنی گرمی میں میری بیوی باقی کام نبٹا لے، چاند چودھویں کا پوری آب وتاب سے روشن مگر یوں گرم چاندی لیے کہ جیسے چاند میں بھی ٹھنڈک نہ رہی ہو۔

رات کا وقت تھا مگر انسانی زندگی پر ابھی بھی زمین مہربان نہ ہوئی۔ خیر سے عورتیں مردوں کو کھانا کھلا کر فارغ ہو گئیں۔ چار پائیاں گسھیٹ کر لاتی لڑکیاں آپس میں چہکنے لگیں تھیں، بچے بالے فکر سے آزاد دادی اماں سے کہانی سن رہے تھے تو کچھ چاند کی روشنی میں بیٹھے بزرگوں کے پاس کھیلنے میں مصروف تھے۔ نجانے یہ لوگ اتنے گرم علاقے میں اور پھر اتنی گرمی میں محبت و نصرت، یگانگی، کھلکھلاہٹ، خوش دل رشتے، بسنت کے رنگ، خوشبوئیں، مہکتے گلاب جیسے رشتے کیسے قائم رکھے ہوئے تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے زمین لرزنے لگی۔ ہنستے چہرے پہلے تو غم زدہ اور پھر آہستہ آہستہ مرجھانے لگے۔ آوازیں، شور، قہقے چیخنے لگے، سسکیاں، آہیں، لال ٹینوں کی بجھی روشنیاں اور اس کے بعد ایک دھماکہ سا ہوا، لاوا پھٹ پڑا۔

زمین نے اپنی اندرونی گرمی باہر نکال دی جیسے ان معصوم لوگوں کی زندگیوں سے عجیب واقعہ رونما ہوا کہ زمین آتش فشاں اگلنے لگی۔ آگ نکلی اور تھر کو کھا گئی۔ محبتوں کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ گھونگھٹ نکالتی لڑکیاں چہروں پر گھونگھٹ ڈالے ہی خالق حقیقی سے جا ملیں۔ زندگیاں صبر، محبت، مہکتے گلابوں جیسے رشتے زمین کے غیض و غضب کے سنگ ہو گئے، محبتوں کے تمام رنگ وہ لوگ پھر سے ڈھونڈنے لگے۔ قریب سے کوئی این جی اوز کا ایک گروپ گزرا، وہ اپنے حلقے کے لوگوں کو کام پر لگا کر 1122 کو بلانے لگے۔ کوئی زندہ نہیں تھا، میڈیا پہنچا، تصویریں بنائی گئیں، موقع پر دہشت گردی کا ثبوت لیا گیا۔ خبریں نشر ہوئیں مگر کسی نے بھی ان کے علاقے کے باقی لوگوں کی ترقی کے لیے نہیں سوچا، خاموش لوگ، خاموش زندگی، خاموش موت، لمحہ لمحہ شرر فشاں۔

الجہاد سیریز

ع ا ملہی

یہودی مملکت کی ضرورت اور غاصبانہ رویے:

1895ء میں ایک یہودی مفکر "النمساوی ہیر تسل" نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا: "یہودی مملکت" جس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہودی قوم کو ایک حکومت کی ضرورت ہے، اس مقصد کے لیے فلسطین سے بہتر کوئی جگہ ان کی نظر میں نہ تھی۔ اس دور میں یہودیوں کی عالمی سطح پر دو بڑی کانفرنسیں ہوئیں، پہلی کانفرنس 1897ء اور دوسری 1898ء میں، جن کا حاصل یہ تھا کہ یہود اپنے قدیم وطن فلسطین کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے منظم ہو جائیں، چونکہ فلسطین خلافت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور وہی اس کے مالک و متصرف تھی، اس کے مقابلے کے لیے قوم یہود نے ہر طرح کے حربے استعمال کرنے شروع کر دیے۔

یہودی مملکت کا استحقاق اور علامہ اقبال:

بقول علامہ اقبال جون 76 عیسوی کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد یہودی اور یہود نواز حلقوں کی ایک رائے یہ سننے میں آ رہی ہے کہ یہودیوں کو عربوں نے ان کے وطن سے نکالا تھا۔

اس لیے اگر انہوں نے اپنا وطن دوبارہ زبردستی لے لیا ہے تو اس میں ان کا کیا قصور، یہ سرزمین تو جیسا کہ صیہونی (ZIONISTS) کہتے ہیں ارضِ موعودہ (PROMISED LAND) ہے جہاں ہر یہودی کا آنا بہت ضروری ہے۔

اقبال نے اپنے خطوط و بیانات میں اس کا جواب دیا تھا کہ یہودی فلسطین سے اپنی مرضی سے نکلے تھے اور یہ "خروج" عربوں کے فتح فلسطین سے پہلے ہی ہو چکا تھا تاہم اقبال نے یہودیوں کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سوالیہ اٹھا دیا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دوسرے یورپین مفتوحہ علاقوں پر کیوں نہیں ہو سکتا ہے، یہودیوں کا یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین امریکہ پر اور ہن، گاتھ اور گال قومیں برطانیہ پر دعویٰ کر دیں یا ہندوستان کے آریہ ایران اور روس پر دعویٰ کر دیں کہ ان کا وطن اصلی واپس دیا جائے۔ اقبال کی نظر میں یہ تاریخی ظلم، اس کے ساتھ مذاق اور اسے اپنی مرضی سے بدلنے کی مضحکہ خیز کوشش ہے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملہی

اگر انہیں وطن دیناہی ہے تو جرمنی میں دیناچاہیے جہاں سے وہ نکالے گئے، اپنے دعویٰ سے ہزار سالہ دست برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیادعویٰ بالکل بے دلیل ہے اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے۔

ہے خاکِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیتِ انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا

خلافتِ عثمانیہ کے عہد میں یہودی سازشیں:

خلافتِ عثمانیہ کے آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید کو اپنے دام تزویر میں پھنسانے کے لیے انہوں نے مختلف سطحوں پر ساز باز شروع کی، جس میں بھاری رقوم دے کر ترکوں کو خریدا گیا، خود خلیفہ عبدالحمید کو لالچ دیے گئے یہاں تک کہ ایک دفعہ ترکی کے یہودیوں کا ایک وفد سلطان سے ملا اور ان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فلسطین اگر یہودیوں کو دے دیا جائے تو اس کے بدلے ہم خلافت عثمانیہ کے ماتحت رہ کر خلافت کے سارے قرضے اتار دیں گے، جواب میں سلطان نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر ان کو دکھایا پھر فرمایا: "اگر فلسطین کا اتنا حصہ بھی تم لیناچاہو گے تو نہیں ملے گا"۔

سلطان عبدالحمید سے مایوس ہو کر اللہ کے غضب کی ماری اس قوم نے ان کی شہرتِ عام کو بگاڑنے کی کوشش شروع کردی، چونکہ ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کی اجارہ داری تھی اس لیے اس ہتھیار سے کام لے کر سلطان پر "رجعت پسند اور نسل پرست" جیسے بے پر کے الزامات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، نتیجتاً خلافتِ عثمانیہ میں قومی نعروں کی پروان ملی۔ 1909ء میں سلطان عبدالحمید کا انتقال ہوا تو گویا اس دن سے اسرائیل کے وجود کی بنیاد پڑ گئی، حکومت میں موجود صہیونیت نواز لوگوں کا ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو برابر یہودیوں کو فلسطین منتقل کرنے میں مدد دیتا رہا، یہاں تک کہ 1897ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار تھی اور یہی تعداد 1914ء میں 85 ہزار ہو گئی۔ یہود ایک مالدار قوم تھے، ہر ملک میں بڑے بڑے بیوپاریوں اور ساہوکاروں کی صورت میں موجود تھے، جس کی وجہ سے ملکوں کی سیاست اور معاملات پر ان کا اثر انداز ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں تھا، انہوں نے خلاف عثمانیہ کو ہر طرح اور ہر سطح پر دباؤ میں رکھنے کی کوشش کی، اور دنیا کو باور کرایا کہ فلسطین کا حصول یہودیوں کے لیے ناگزیر ہے، لیکن خلافتِ عثمانیہ ان کے باطل عزائم اور ارادوں کے سامنے سد سکندری ثابت ہو رہی ہے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملہی

چنانچہ اس بے حقیقت مفروضے کی بنیاد پر حکومت مصر کے توسط سے صحرائے سینا میں یہودیوں کو بسانے کی ایک مرتبہ کوشش بھی کی گئی، جس میں وہ ناکام ہوئے۔اس کے بعد دنیا کی سیاست میں کچھ ایسے حالات آئے جو فلسطین میں بدی کی "نمائندہ قوم" کے لیے قیام حکومت کی راہ ہموار کرتے چلے گئے، جن میں چار حالات کا بطور خاص ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے:

1) دو عالمی جنگوں کا وقوع پذیر ہونا۔
2) ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کا قتلِ عام جس سے وہ دنیا کو اپنی مظلومیت ثابت کر پائے۔
3) خلافتِ عثمانیہ کا سقوط۔
4) فلسطین کا برطانوی استعمار کے زیر دست ہو جانا۔

آخر الذکر سبب کے تحت برطانوی استعمار نے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے حتی المقدور تعاون کیا۔ مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا، یہودی بستیاں آباد کی گئیں، تل ابیب کو مضبوط کیا، یہودیوں کے استحکام سے مطمئن ہو کر خود 14 مئی 1948ء کو فلسطین سے نکلنے کا اعلان کیا، جاتے جاتے اہم مقامات، سرکاری دفاتر، ہوائی اڈے یہودیوں کو بطور بخشش دے گئے، جبکہ مسلمانوں کا جانی، مالی اور اقتصادی استحصال کیا گیا۔

جس کے نتیجے میں کچھ قتل ہوئے اور اکثر ہجرت پر مجبور ہوئے۔یوں 15 مئی 1948ء کو اسرائیلی مملکت کا اعلانِ قیام ہو گیا۔

بقول مولانا علی میاں: پہلی جنگِ عظیم کا افسوسناک انجام یہ تھا کہ نزلہ عالمِ اسلام پر گرا، ادھر ترکی کی خلافتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھر گیا اور اتحادیوں نے سیاسی بندر بانٹ اور تقسیم کا پرانہ حربہ آزادی سے استعمال کیا، چنانچہ ترکی کا مشرقی حصہ روس کے ہاتھ لگا اور مغرب کے یورپی صوبے بلقان، ہنگری، بلغاریہ وغیرہ مکمل طور پر خود مختار ہو گئے، ایران اور شام فرانس کے ہاتھ لگا اور مصر اور عراق پر برطانیہ نے قبضہ جمایا، اس طرح سے عالمِ اسلام کے حصے بخرے ہو گئے۔ فلسطین کا مسئلہ ذرا بین الاقوامی نوعیت کا تھا اس لیے اسے "تہذیب وترقی" کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے برطانیہ کے زیرِ انتداب رکھا گیا اقبال اس صورتحال پر روشنی ڈالتے ہیں اور یورپ کی اس سیاسی چال کو سامنے لاتے ہیں کہ وہ پہلے کمزور ممالک کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے اور پھر اس کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بھی بہاتا اور ہمدردی ظاہر کرتا ہے تاکہ عالمی سیاسیات میں ساکھ بھی قائم رہے اور اپنا مقصد بھی نکل آئے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملھی

کیونکہ وہ سلامتی اور امن کو پسند کرتا تھا، کہا جاتا ہے کہ آپ کو "ملک السلام" اور شہر کو سلامتی کا شہر یعنی "یروشالم" پکارا جاتا تھا اور اس کے پرانے بادشاہ ایک خدا کو ماننے والے سامی عرب تھے۔ان تاریخی شواہد کو ماننے کی بجائے اہل مغرب اور یہود سرے سے فلسطینیوں کے وجود ہی سے منکر ہیں جیسا کہ اسرائیلی وزیر اعظم "گولڈا میئر" نے کہا: "فلسطینیوں کا اس بستی میں کبھی وجود ہی نہیں تھا"۔

میں جتنی فلسطین کانفرنسیں ہوئیں سب میں اقبال کے مشورے اور ہمدردیاں شامل تھیں، علامہ نے فلسطین رپورٹ کے خلاف مسلمانان لاہور کی کانفرنس کے موقع پر ایک بیان دیا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے، مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے جیسا مشرق قریب کی صورتحال سے واقف کسی شخص کو ہو سکتا ہے۔یہ مسئلہ مسلمانانِ علام کو ایک موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت سے اس امر کا اعلان کردیں کہ وہ مسئلہ جس کا حل برطانوی سیاستدان تلاش کر رہے ہیں محض قضیہ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہو گا۔

مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے،،بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود تو 13 صدیاں ہوئی حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل ختم ہو چکا تھا، فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادہ سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا، مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا، زمانہ حال کے تاریخی انکشافات نے "پیٹر وی ہرمٹ" کی ہستی ہی کو محل اشتباہ قرار دے دیا ہے، الخ۔۔۔

القدس میں قیمتی مخطوطات اور کتب خانوں پر حملے:

یہود کی فکری اور سیاسی بددیانتی کے اسی تناظر میں صیہونیت کی دہشت گردی کا ایک اور انتہائی خوفناک زاویہ فلسطین اور القدس میں موجود اسلامی کتب خانوں اور مخطوطات کو تباہ اور ضائع کرنا ہے، جن کی ایک معتد بہ (کثیر) تعداد اس ارض مقدس میں موجود ہے، لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ ارض مبارک میں موجود یہودی تسلط کی وجہ سے اس گرانقدر علمی ورثہ اور مسلم دینی متاع سے بہت کم لوگ آشنا ہیں۔

الجہاد سیریز

ع ا ملہی

حقیقت یہ ہے کہ اس مبارک سرزمین پر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا فاتحانہ داخلہ (385ھ) دو زاویوں سے خاص طور پر ایک اہم ترین تاریخی وقوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

1۔ علمی زاویہ: 2۔ سیاسی زاویہ:

ہمارا موضوع چونکہ علمی زاویہ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے سردست "سیاسی زاویہ" کو پسِ منظر میں رکھتے ہوئے یہود کی صرف علمی بد دیانتیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اگرچہ یہ زاویہ بھی کسی طور بھی غیر اہم نہیں ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے "القدس" فتح کرنے کے بعد سب سے پہلے مدارس اور تحقیقی اداروں کے قیام کا حکم دیا۔ جس کے لیے مسجدِ اقصیٰ کے کتب خانے میں کتابوں کی ایک بڑی تعداد کا اضافہ کیا۔ قرآنی نسخوں کی بڑے پیمانے پر تیاری کا حکم، فقہ اور لغت کی عظیم درسگاہیں "دارالاسبّار"، "مدرسہ صلاحیہ" اور مسجدِ اقصیٰ کے منبر کی پچھلی جانب "مدرسہ خنشنیہ" قائم کی گئیں۔ نیز ان اداروں میں قیمتی مخطوطات اور کتب بہم پہنچائی گئیں۔

صلاح الدین ایوبی کے بعد اس کے پیروکاروں نے اسی طریقہ سے مدارس و مکاتب کے قیام میں اپنا کردار ادا کیا۔

نادر کتابوں اور مخطوطات سے ان اداروں کو بھر دیا، اس طرح علمی دنیا میں فلسطین قیمتی مخطوطات کا مرکز بن گیا۔ صرف "القدس" میں تقریباً دس بڑے کتب خانے ماضی قریب تک موجود تھے، جن میں سے سب سے زیادہ مخطوطات "دار کتب المسجدِ الاقصیٰ" اور "دار کتب اُل خالدی" میں رہے۔ دار کتب "اُل خالدی" حرم شریف سے آتے ہوئے دائیں جانب باب السلسلۃ کی لکیر پر واقع ہے۔ اس مکتبہ میں دس ہزار مصنفین کی تحریر کردہ کتب جن میں سے پانچ ہزار مخطوطات کی صورت میں موجود تھیں۔ جبکہ دار کتبِ المسجدِ الاقصیٰ جو کہ مسجدِ اقصیٰ کی مغربی جانب واقع ہے، اس میں تقریباً ایک ہزار مخطوطات ہیں جو اسلامی اور عربی علوم کی قیمتی ترین متاع شمار کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور کتب خانہ "دار الکتب الخلیلیہ" کے نام سے بھی موجود ہے، جس کو شیخ محمد بن محمد الخلیفی (1147ھ) نے وقف کیا، اس میں بے شمار مخطوطات تھے جو علم دشمن یہودیوں کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ "دار الکتب الفخریہ" میں بھی تقریباً دس ہزار سے زائد کتب کا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ "خزانہ اُل قطینہ حنبلیہ" بابِ عمود پر واقع ہے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملھی

اس مکتبہ میں علم ریاضی، فلکیات، نجوم اور دیگر سائنسی فنون پر مشتمل کتب کا بہترین ذخیرہ اور خزانہ موجود تھا، لیکن آج یہاں کوئی ایسی قابل ذکر قیمتی کتاب نہیں ملتی جو علم میں نئے اضافے کا سبب بن سکے۔

یہودیوں نے مسلمانوں کی اس علمی متاع کو بھی مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ مخطوطات کا ایک بہت بڑا مرکز "خزانہ اُل البدیری" ہے، یہ مسجدِ اقصیٰ کے پہلو میں واقع ہے، اُل بدیر کے قیمتی مخطوطات ونوادر یہاں موجود تھے، اسی طرح علامہ عبداللہ مخلص کا خزانہ کتب بھی انفرادی اہمیت کا حامل ہے، اس میں تاریخی آثار اور مزاحمتی ادب پر مشتمل بہت سا سرمایہ محفوظ تھا، شیخ عبداللہ مخلص ان عظیم فلسطینیوں میں شمار ہوتے تھے جنھوں نے مخطوطات کے کردار اور ان کی علمی اہمیت اجاگر کرنے میں اپنا وقیع کردار ادا کیا۔ فلسطین میں ہی ایک اور قابل ذکر کتب خانہ "خزانہ الشیخ محمود اللحام" کے نام سے پہچانا جاتا ہے، یہاں چار ہزار سے زائد مصنفین کی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار نجی کتب خانے اور ذاتی ملکیت کی لائبریریاں ہیں۔

ان میں قدیم مصاحف، ربعات، کتب تفسیر و تجوید، قرأت، رسم، حدیث، کتب اصول، فقہ و فتاویٰ، مذاہب اربعہ، فرائض، کلام، تصوف، مواعظ و حکم، نحو و بلاغت، ادب، سیاست، قوانین، سیرت، مناقب، تراجم، فلکیات، طب اور متفرق جامع کتب موجود ہیں۔

صیہونی عزائم:

لیکن آج کی صورتحال یہ ہے کہ ذکر کردہ کتب خانوں میں سے صیہونیت نے تقریباً 70 فیصد مخطوطات اور نادر کتابیں غائب کر دی ہیں اور تاحال صیہونیت اس ارضِ مقدس سے اسلامی ورثہ اور اس کے انسانی، اخلاقی، علمی اور سیاسی اثرات کو ملیامیٹ کرنے کی مسلسل کوشش میں ہے۔ صیہونیوں کی اس علمی اور ثقافتی ورثہ کی پامالی اور اعلانیہ دہشت گردی کی جو بھی وجوہات بیان کی جائیں جہاں وہ سب غیر منصفانہ، خلافِ عقل اور ظلم پر مبنی ہیں، وہیں اس کی حقیقی وجہ کا ادراک بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ مغرب کو اپنے مراکز، تحقیقی اداروں، جامعات اور مستشرقین کے ذریعے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ امتِ مسلمہ کو اس وقت تک شکست دینا ممکن نہیں ہے، جب تک ان میں اسلامی تشخص برقرار ہے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملہی

اس لیے اس قوم کو تابع بنانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے امتِ مسلمہ کے منفرد اسلامی تشخص اور علمی میراث کا خاتمہ اور روحِ اسلام کے اس جذبہ کا خاتمہ جو ان کو دنیا کی بڑی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کی قوتِ محرکہ فراہم کرتا ہے۔

مہذب مغربی دنیا علم کے ساتھ اپنے تعلق اور وابستگی کو اس طرح پیش کرتی ہے گویا صفحۂ ہستی پر علم و تحقیق کے میدان میں غیر جانبدارانہ رویوں کے اظہار میں ان کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے، لیکن اس مغربی تاثر کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ انھی طاقتوں کی پروردہ ریاست اسرائیل کھلے عام فلسطین میں علمی و تعلیمی اداروں اور وہاں کے بیش قیمت کتب خانوں کو اپنی بمباری کا نشانہ بنا کر اس کو ضائع کرتی ہے اور ایسے میں پوری مغربی دنیا، انسانی حقوق کی تنظیمیں اور فروغِ تعلیم و تحقیق کے لیے آواز اٹھانے والی این جی اوز اپنے بلند آہنگ نعروں کے باوجود اس علمی ورثہ کے ضیاع پر قطعی خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ہیں۔

اسلامی مدارس و معاہد کی تخریب اور نظام تعلیم کی تباہی:

المیہ یہ ہے کہ آتش و خون، بارود اور گولیوں کی جنگ کے بعد اسرائیلیوں نے ایک نئے محاذ کی دریافت کی ہے، اس محاذ میں فلسطین کی وہ تعلیمی نسل نشانۂ تخریب ہے جس پر پوری قوم کی قسمت معلق ہے، ضروری ذرائع تعلیم، قلم، کاپی، پینسل اور اس طرح کی ہلکی پھلکی ضروریات پر پابندی اور تعلیمی میدان میں فلسطینیوں کو ناخواندہ رکھنے کی ہر کوشش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، دراصل پہلے فلسطین کی فضاء میں گولیوں کا بہترین نشانہ فلسطینی عوام کی جسموں سے نکلنے والے بارود کی بو ہوتی تھی اب وہ طلبہ و طالبات کی اندرونی شخصیتوں کی چرمراہٹ سننے کی عادی ہو گئی ہے کیو نکہ جو لڑائی گلیوں کی تھی وہ آج اپنا دائرہ پھیلا چکی ہے افسوس اب تعلیم کی شمع بجھا کر فلسطینیوں کو قسطوں کی تاریکی دکھائی جا رہی ہے تاکہ تعلیم کی روشنی میں فلسطینیوں کو پھر سے کہیں زندہ ہونے کا موقع نہ مل جائے۔

یہ سچ ہے کہ فلسطینیوں کو حصار میں رہنے کی عادت ہے، سنگینیوں کے سائے میں سونا ان کا معمول ہے، ہر صبح لاشوں کو کاندھا دینا ان کی ذمہ داری ہے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملہی

پانی، بجلی، اشیاء ماکولات، طبّی سہولیات اور تعمیرات ہر طرح کی بندش کے باوجود انہوں نے اپنے عزم کو قائم رکھا، اپنا حوصلہ تھامے رکھا، اسرائیلیوں کو ان کا صبر زہر لگا انہوں نے مزید ظلم کرنے کی ٹھان لی اور اس طرح انسانی حقوق کی پامالی کرتے ہوئے غزہ میں اسکولی سامانوں کی درآمد پر روک لگادی۔ فلسطینی اقتصاد و معیشت کے وزیر حاتم عوئضہ نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ غاصب اسرائیل فلسطین میں اسکولی آلات کی درآمدی پر شدت سے روک لگا رہی ہے تا آنکہ انسانی حقوق کی محافظ تنظیموں کے مطالبات کو بھی ٹھکرا دیا ہے حالانکہ ان دنوں غزہ میں اسکولی لوازمات کی بے پناہ ضرورت ہے، مزیدار بات یہ ہے کہ ان سنگین حالات کی اطلاع ان تمام ممالک کو ہے جو حقوق انسانی اور تعلیمی بیداری کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں مگر اس معاملے میں ان کی حساس اور خود ساختہ لبِ گویائی پر خوف و مصلحت کا تالا پڑا ہوا ہے۔

واضح ہو کہ غزہ میں حالیہ اقوامِ متحدہ کے اسکول پر حملہ کوئی نادر واقعہ نہیں بلکہ یہ سلسلہ کئی عشروں سے جاری ہے، چنانچہ غزہ میں اس تعلیمی ظلم کے خلاف 9 ستمبر 2009ء کو فلسطینی طلباء وطالبات نے زبردست احتجاج کیا تھا۔

وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں احتجاجی بینر تھامے ہوئے تھے جس پر متعدد احتجاجی جملے رقم تھے مثلاً "ہماری کتاب اور ہماری کاپیاں کہاں ہیں"، "ہم نونہالان پر لگائی گئی تعلیمی بندش کو ختم کرو، ہم پڑھنا چاہتے ہیں، ہم اپنا تعلیمی حق چاہتے ہیں"۔ اس احتجاجی جلسے کے بعد کم عمر طلباء نے اقوامِ متحدہ کے مقامی مرکز کو اسرائیل کی ظالمانہ بندش پر اپنا احتجاجی پیغام پیش کیا جس کے مخاطب اقوامِ متحدہ کے صدر بان کی مون تھے، اس احتجاجی وفد کا مطالبہ یہ تھا کہ موصوف محترم اور عالمی برادری اسرائیل کی تعلیمی خلاف ورزیوں پر روک لگائیں۔ نو سالہ اکرم احمد پوری معصومیت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ "یہودیوں نے میرے والدین کو مار ڈالا اور ہماری رہائش گاہوں کو زمین بوس کر ڈالا، میری کاپیاں اور میری کتابیں اس ظالمانہ کاروائی کی نذر ہو گئیں، مجھے کتاب، قلم اور کاپی کی ضرورت ہے، میں پڑھنا چاہتا ہوں"۔ مشہور عربی مجلہ "فلسطین مسلمہ" کے اعداد و شمار جو انہوں نے فلسطینی وزارتِ تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے، کے مطابق اس سال 240 طلباء اور 15 اساتذہ اسرائیلی دہشت گردی کی نذر ہوئے اور تقریباً 942 طلباء اور اساتذہ زخمی ہوئے جن میں سے اکثر پوری طرح اپاہج ہو چکے ہیں۔

الجہاد سیریز

اعلمی

اس رپورٹ میں یہ بھی درج ہے غزہ میں تقریباً 7 اسکول پوری طرح تباہ اور بے شمار تعلیم گاہوں کو جزوی طور پر نقصان پہنچایا گیا ہے، علاوہ ازیں اب تک پورے فلسطین میں مجموعی طور پر 4828 ایسے مکانوں کو پوری طرح منہدم کر دیا گیا ہے، جس میں اسکولی طلباء مقیم تھے اور اسی طرح کے 9738 مکانوں کو جزوی نقصان پہنچایا جاچکا ہے، وزارتِ تعلیم و تربیت کے ترجمان خالد راضی نے فلسطین مسلمہ کو دیے گئے اپنے انٹرویو میں کہا کہ: "حالیہ جنگ نے تعلیمی میدانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے خصوصاً تعلیم گاہوں، ہاسٹلز، کلاسوں اور لائبریریوں کو پوری طرح نشانہ بنایا گیا ہے"۔ اسرائیل جس طرح مدارس اور تعلیم گاہوں کو برباد کر رہا ہے اس سے یہی اشارہ ملتا ہے کہ اسرائیل فلسطینیوں کے ہر حق کو پامال کرنا چاہتا ہے، لائبریریوں، درسگاہوں اور اقامت گاہوں کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسکولی اشیاء پر مکمل بندش لگا کر یقیناً اسرائیل نے شیطنت کا عظیم مظاہرہ کیا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام مظالم پر دنیا کب تک خاموش رہے گی؟

ساری دنیا کی مسلم آبادی، ماہرینِ فن، مسلم دانشور اور اسلامی تنظیمیں اس سلسلہ میں گہری تشویش سے دوچار ہیں۔

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سرزمین کو ان کے ایمان اور یقین کی کیفیات سے ایک مضبوط رشتہ اور تعلق ہے، فلسطین کی مساجد، مکاتب اور علمی اکیڈمیاں دراصل ہماری عظیم اسلامی ثقافت کا قیمتی سرمایہ ہیں، لیکن چونکہ مغربی دنیا کو اسرائیل ہی کے مفادات کا تحفظ عزیز ہے اس لیے وہ اس غیر اخلاقی حرکت پر کسی ملال اور اندیشے کا اظہار نہیں کرتے۔ پیشِ نظر مقالہ میں آج کی طاقتور دنیا کا یہی منافقانہ چہرہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کس طرح فلسطین میں علوم کے مراکز گرتا دیکھ کر چپ سادھنے کے باوجود بھی تحقیق و آگہی سے اپنا تعلق ظاہر کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔

الغرض اسلامی امت کا اس مبارک ارضی ٹکڑے سے دینی، ثقافتی اور سماجی تعلق توڑنے کے لیے مغربی اور صیہونی علمی دہشت گردی ایک ایسا پہلو ہے جو نسبتاً نظروں سے اوجھل رہا ہے مگر اثرات اور خطرات کے اعتبار سے زیادہ مہلک اور نقصان دہ ہے، یہود مسلم علمی ورثہ کو غائب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تاکہ اس زمین سے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے تعلق کا کوئی بھی دستاویزی ثبوت نہ مل سکے۔

الجہاد سیریز

ع ا ملھی

لیکن اب ہمیں دھوکہ، فریب، ظلم اور دسیسہ کاریوں کے اہم کرداروں کو بے نقاب کرنا ہے اور دنیا پر یہ واضح کرنا ہے کہ مغرب کے پیشِ نظر حق وانصاف کی بنیاد پر مسائل کا حل کبھی نہیں رہا ہے بلکہ اس کے نزدیک مشرقِ وسطی میں مسلمان مرد، عورتیں اور بچے نہیں بستے بلکہ وہاں اس تہذیب اور دین کے وارث اور ماننے والے بستے ہیں جو مغرب (عیسائیت اور یہودیت) کے لیے ایک ہزار سال تک سنگین خطرہ بنے رہے۔ہاں !البتہ آج وہاں سے تیل پھوٹتا ہے جو مغرب میں خوشحالی کے چراغ جلائے رکھنے کے لیے ناگزیر ہے۔دنیا کو اب یہ باور کروانا ضروری ہو گیا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جس وقت مغرب کو اپنی فکر اور نظام کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا اور اس کے مسلسل ترقی کے خواب بکھر گئے تو اس نے اپنی تاریخ کے سب سے سنگین مسئلے یعنی اسلام سے نبٹنا اور اس کے حل کی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں،تاکہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔

ہائے سائنس، وائے سائنس

شازیہ آفرین

کچھ لوگ جہاں پر سائنس دانوں کو عظیم ہستی مانتے ہیں وہیں پر کچھ لوگ عقل و فراست کی بات کہنے والے کو پاگل کہتے ہیں یعنی کہ سائنس دانوں کو پاگل کہتے ہیں۔ شاید یہ صحیح بھی ہے کیونکہ ایڈیسن صرف 3 ماہ ہی اسکول میں رہے اور پھر ان کے استاد نے انہیں کند ذہن قرار دے کر اسکول سے خارج کر دیا تھا۔ ہمارے استاد بھی کہتے ہیں کہ اگر آپ لوگوں کو کوئی پاگل کہتا ہے تو آپ لوگ برا ماننے کے بجائے خود کو سائنس دان سمجھیں اور جس کو جتنے زیادہ لوگ پاگل کہیں وہ خود کو اتنا بڑا سائنس دان سمجھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاگل پنے کا سائنس دان ہونے سے گہرا تعلق ہے۔ یعنی "سائنس دان پاگل پنے کے براہ راست متناسب ہے۔"

میرے اس فارمولے سے آپ یہ نتیجہ نہ اخذ کریں کہ میں بھی ایک سائنس دان ہوں۔ میرا ماننا ہے کہ سائنس دان صرف پاگل ہی نہیں اول درجے کے کاہل بھی ہوتے ہیں جو معمولات کے کاموں کو کرنے کے بجائے فضولیات سوچتے رہتے ہیں۔

آئن سٹائن صاحب کو ہی دیکھیں زمان و مکان پر اپنے نظریات بتاتے ہوئے "ہر شے اضافی ہے"، کہہ کر ہمارے تعلیمی نصاب پر اضافی بوجھ ڈال دیا اور بیٹھے بیٹھے ہی انھوں نے فوٹون [روشنی کے اجزائے ترکیبی] کے وجود کا مفروضہ پیش کیا اور ذہن میں بٹھا لیا کہ روشنی برقیاتی اور مقناطیسی شعاعوں پر مبنی ہے۔

ارے بھئی روشنی تو روشنی ہے جو اندھیرے میں سود مند ہے۔ اس میں برقیاتی لہریں ہوں یا مقناطیسی یہ تو کوئی فضول انسان ہی سوچے گا جس کو کسی کام سے غرض نہ ہو۔ عام انسان تو روشنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کام سرانجام دے گا۔

یہ ہی نہیں ایک اور صاحب ان کے ہم فرقہ ہیں نام بھی بھاری سا ہے ان کا، آئزک نیوٹن۔ ان کا نام لیتے وقت ہی زبان کو اضافی طاقت لگتی ہے جو دماغ کو ایکسلیریٹ کر دیتی ہے اور دماغ میں ایک ایک کر کے ان کے سارے کارنامے وارد ہوتے جاتے ہیں۔ یہ نیوٹن صاحب تو آئن سٹائن صاحب سے بھی دس فرلانگ آگے نکلے۔ انہوں نے آئن سٹائن کے مفروضے کو بنیاد بنا کر کششِ ثقل کی تھیوری پیش کر دیا۔ ایسے کہ وہ ایک دن باغ میں بیٹھے تھے، کاہل انسان ہی کام دھندا چھوڑ کر باغ میں بیٹھے گا۔

جس بینچ پر یہ بیٹھے تھے اس کے سامنے ہی ایک سیب کا درخت تھا اور نیوٹن صاحب کی نظر ایک پکے ہوئے سیب پر تھی کہ اتنے میں وہ پکا ہوا پھل درخت سے ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔ اب وہ سوچنے لگے کہ یہ پھل نیچے ہی کیوں گرا، اوپر کیوں نہیں گیا؟ حالانکہ اس میں سوچنے والی کوئی بات نہیں ہے ہر چیز نیچے ہی گرتی ہے اور پہلے بھی گرتی ہی رہی تھی اس دن کوئی پہلی دفعہ نہیں گری تھی۔

ہائے سائنس، وائے سائنس

شازیہ آفرین

لیکن اپنی کاہلی کی وجہ سے انہوں نے بینچ پر بیٹھے بیٹھے ہی سوچنا شروع کر دیا اور کششِ ثقل کا نظریہ پیش کر دیا۔ جبکہ ہم یا کوئی اور غیر سست انسان ہوتا تو بینچ سے اٹھتا، سیب اٹھاتا اور خوشی خوشی کھاتا ہوا باغ سے نکل جاتا، کچھ سوچتا نہیں۔ سوچتا بھی تو فقط اتنا کہ کہیں باغ کے مالک سے واسطہ نہ پڑ جائے۔

ایک اور بڑے سائنس دان گزرے ہیں، تھامس الوا ایڈیسن۔ یہ صاحب فقرتاً ہی نہیں فطرتاً بھی کاہل تھے۔ یہ ہوم ورک مکمل کیے بغیر ہی اسکول جاتے تھے اور اسکول میں بھی اپنی کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر صرف سوچتے ہی رہتے تھے۔ نتیجے میں انہیں 3 ماہ میں ہی اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ اب تو ان کے پاس فارغ وقت ہی وقت تھا۔ یہ اپنے گھر کے پچھلے صحن میں بیٹھے چرند پرند، پیڑ پودوں کو دیکھتے رہتے اور سوچتے رہتے تھے۔ کبھی دل ہوا تو کچھ گھاس پھوس جمع کر کے الٹے سیدھے تجربے کر لیتے۔ ایک بار انہوں نے ایک چڑیا دیکھی جو پھدکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکوڑے چگ رہی تھی۔ چڑیا کا پھدکنا ان کو اتنا بھایا کہ یہ خود بھی پھدکنے لگے۔ ان کو پھدکتا دیکھ کر چڑیا اڑ گئی۔ اب ان کے ذہن میں ایک نئی سوچ کا جنم ہوا۔

انہوں نے سوچا کہ چڑیا کیڑے مکوڑے کھاتی ہے اس لیے اڑتی ہے اور ہم لوگ بریڈ مکھن وغیرہ کھاتے ہیں اس لیے نہیں اڑتے۔ لہٰذا انہوں نے انسانوں میں بھی اڑنے کی صلاحیت پیدا کرنے طریقہ سوچا۔ کچھ کیڑوں مکوڑوں کو چنا اور پیس کر ٹانک بنایا اور ملازمہ کی بیٹی کو پلا دیا۔ وہ بیچاری کچھ دن بیمار رہ کر دنیا سے ہی اڑ گئی۔ پھر انہوں نے جانداروں کو چھوڑ کر نباتات کو اپنا نشانہ بنایا اور ایک دن چند بانس کی کھپچیوں اور پتیوں سے برقی توانائی اور برقیاتی روشنی کا نظام کا آلہ ایجاد کیا جسے ہم بجلی اور بجلی کے بلب کے نام سے جانتے ہیں۔ آج اس بجلی کی طاقت سے ہماری زندگی کے آدھے سے زیادہ کام انجام پا رہے ہیں۔ بجلی کی طاقت سے ہی مختلف مشینیں، موٹر گاڑیاں وغیرہ چل رہی ہیں اور گھنٹوں کا کام منٹوں میں مکمل ہو رہا ہے۔ اس بجلی نے ہم لوگوں کو بھی کاہل بنا دیا ہے۔ آٹا گوندھنا ہو، مصالحہ پیسنا ہو، قیمہ بنانا ہو (شوہر کا نہیں)، جوس نکالنا ہو، کپڑے دھونا ہوں، غرضکہ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کام بھی ہم مشینوں سے کرتے ہیں۔ اگر یہ بجلی نہ ہوتی تو میں یہ فکاہیہ بھی نہ لکھ رہی ہوتی بلکہ پتھر کی چکی پر گندم پیس کر آٹا نکال رہی ہوتی کہ اگلے وقت شوہر اور بچوں کو روٹی بھی دینی ہے۔

غزل

رفیقؔ چوگلے

خدا کرے نہ کبھی بھی کسی کے ساتھ رہے
وہ حادثے جو مری زندگی کے ساتھ رہے

ہزار غم بھی جہاں میں خوشی کے ساتھ رہے
یہ مسئلے تو یہاں پر سبھی کے ساتھ رہے

وہ اپنے منہ کو چھپائیں گے روزِ محشر میں
تمام عمر جو بے پردگی کے ساتھ رہے

کنارہ کر لیا جب زندگی نے وقتِ قضا
تبھی یہ جانا کہ ہم اجنبی کے ساتھ رہے

اسے جہان میں حاصل ہے سر بلندی رفیقؔ
کبھی کو بھول کے جو شخص ابھی کے ساتھ رہے

بچوں کی نظم

محمد فرید فریادؔ

ننھے سے ہم بچے ہیں   بھی کسی سے پھرتے ہیں
دل کے لیکن سچے ہیں   کبھی گلے مل جاتے ہیں
کوئی ہنر معلوم نہیں   پل میں روٹھ کے روتے ہیں
ابھی تو پورے کچے ہیں   فوراً مان بھی جاتے ہیں

رب کا ہم پر ہے احسان   دادا دادی پیار کریں
امی ابو اچھے ہیں   بانہوں میں بھر لیتے ہیں
ان کے دم سے کھانے کو   اچھی بات سکھاتے ہیں
اچھے کھانے ملتے ہیں   پھل میوے بھی دیتے ہیں

امی سے ہر روز نئی
بات نبیؐ کی سنتے ہیں
سوتے ہیں جب راتوں کو
اچھے سپنے بنتے ہیں

خط
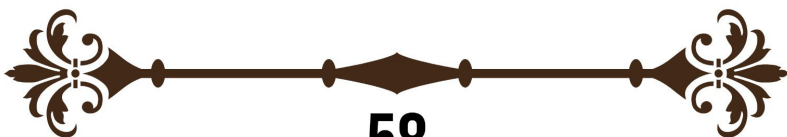
خالد سیف اللہ

(صحافی، ہفت روزہ اخبار ملی بصیرت ممبئی، انڈیا)

محترمہ ثناء اکرم ملی صاحبہ! انچارج ماہنامہ القلم اردو جہانیاں
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ!
میں خیریت سے ہوں اور امید ہے کہ آپ سب لوگ اللہ کے فضل و کرم سے بخیر و عافیت ہوں گے۔
ماہ اگست کا رسالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا، مجھے بہت خوشی ہوئی پڑھ کر۔ اس کے تمام سلسلے تقریباً بہت اچھے تھے لیکن ہماری ایک رائے ہے کہ اگر اس میں درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا عنوان بھی شامل کر لیا جائے تو فائدے سے خالی نہیں ہے۔
اس رسالے میں مجھے ایک کمی نظر آئی، وہ یہ کہ ہر صفحہ پر عنوان لگا ہوا ہے اور ہر صفحہ کے آخیر میں جاری لکھا ہوا ہے۔ اگر اس کو ختم کر کے صرف مضمون کے شروع میں عنوان لگایا جائے اور جن کا مضمون سلسلہ وار ہے صرف اس مضمون کے اخیر میں جاری لکھا جائے تو رسالے کے حسن میں مزید اضافہ ہو گا۔
ہم دعاگو و دعاجو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مزید ترقیات سے نوازے اور اس رسالے کو قارئین کے لیے نافع بنائے۔ (آمین!)
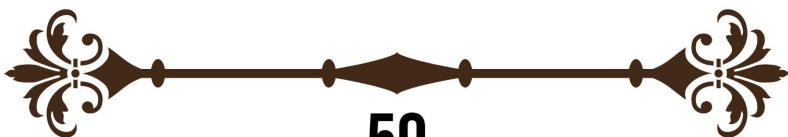
جوابی خط

ثنا اکرم ملھی

(انچارج، ماہنامہ القلم اردو جہانیاں)

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

خوش آمدید ہندوستانی حبیبِ قلم و قرطاس!

ماشاءاللہ آپ کی صحت و عافیت بفضلِ الٰہی اول حالت میں ہونا مسرور کن ہے۔ ہمیشہ خیر آپ کی ہمراہ ہو، ہندوستان سے ادارے کے ساتھ آدھی ملاقات کرنے پہ ہم بے حد مشکور ہیں۔

آپ کو شمارہ میں جو چیزیں گراں گزریں ان پہ ادارہ معذرت خواہ ہے۔ آپ کے اظہارِ رائے کا خیر مقدم، آپ کی دی گئی آراء ادارہ کے لیے بہت قیمتی ہیں۔ ادارہ ان تجاویز کو اسی شمارہ سے زیرِ عمل لا رہا ہے ان شاءاللہ تعالیٰ۔ ادارہ کو احبابِ قلم، خاص طور پر تجربہ کار مدیر و قلم کار کی تجاویز کی اشد ضرورت رہے گی۔ کیونکہ یہ ہمارا شمارہ نہیں، ہم سب کا شمارہ ہے، مسکراہٹ! آپ کے خط میں ادارہ کے لیے خصوصی دعاؤں نے ہمیں بہت مسرور کر دیا، سلامتی ہو آپ پر۔

آپ کی دعاؤں پہ آمین و ایاک!

ہمیشہ لکھتے رہیے اور اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہیں۔

آپ کے اگلے خط کا انتظار رہے گا۔

والسلام

ماہنامہ
القلم
اردو جہانیاں
شمارہ ستمبر 2023ء
AL-QALAM URDU JAHANIAN